اسرارِ اقبال

حسین مہدی رضوی

عاصم بہاری پبلیکیشنز، مراد آباد

ضیاء الرحمٰن انصاری صاحب

نائب وزیر صنعت و رسد عامہ، حکومت ہند

صدر ہاشم پاری پبلیکیشنز بورڈ، مراد آباد

اسرارِ اقبال

تبصروں کے ساتھ علامہ اقبالؒ کی مثنوی

"اسرارِ خودی" کا اُردو میں منظوم اور

معنوی ترجمہ

©

حسین مہدی رضوی

عاصم پہاری پبلیکیشنز

پیرزادہ اسٹریٹ

مراد آباد

نام کتاب ..... اسرارِ اقبال

سنہِ اشاعت ..... سنہ ۱۹۷۵ء

بارِ اول ..... سات سو پچاس جلدیں

مصنف کا نام ..... حسین مہدی رضوی

ناشر ..... عاصم بہاری پبلیکیشنز

پیرزادہ اسٹریٹ - مراد آباد

مطبع ..... ناظم پریس رامپور

دوسرا اڈیشن - سنہ ۷۶ء ——— دو ہزار

قیمت فی جلد ..... گیارہ روپے

اقبال اور عاصم بہاری

آزادیٔ وطن پر قلم اٹھانے والا مورخ مولانا عاصم بہاری کی خدمات کو فراموش نہیں کر سکتا۔ ایک طرف مولانا کی جنگ آزادی میں دی گئی قربانیاں اور دوسری طرف آزاد ہندوستان کی تعمیر میں رنگ بھرنے کی وہ تمام کوششیں ناقابلِ فراموش ہیں جو مولانا نے آل انڈیا مومن کانفرنس کے ذریعہ انجام دیں مولانا ایک بلند پایہ مقرر اور ادب پرور انسان تھے۔ ادب سے ان کا تعلق ان کے نام "عاصم بہاری" ہی سے ظاہر ہے۔

اقبال کی فکر کے گہرے نقوش مولانا کی اُس تحریک میں ملتے ہیں جس کی انہوں نے ابتدا کی اور جس کے نمایاں مقاصد میں سماجی عدم مساوات اور معاشی استحصال کے خلاف وہ مورچہ بند جنگ شامل تھی جسکی ہوک اقبال کے اس شعر میں ملتی ہے۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

معاشی استحصال کے خلاف اقبال کے نعرۂ جہاد کو عملی شکل دینے کے لیے مولانا نے عوامی طاقت کو منظم کیا اور اس نعرہ کو سود مند اور ٹھوس شکل دینے کے واسطے گاؤں گاؤں قریہ قریہ سفر کرتے رہے۔ اور جب اقبال فلسفۂ خودی کا درس دیتے دیتے آغوشِ لحد میں چلے گئے تو یہ مردِ مجاہد خودی کے اس درس کو عام کرتا ہوا عوامی جلسوں میں اپنے سحر آفریں انداز کو بروئے کار لانے میں منہمک نظر آیا جس کے نتیجہ میں یہ سحر آفریں انداز ہندوستان کے کروڑوں معاشی استحصال سے کراہتے لوگوں کے لیے باعثِ رحمت بن گیا اور ایک عوامی طاقت ابھر آئی۔ اقبال کے درسِ خودی کی یہ تفسیر وہ دھوسنے

عمل تھی جو ایک طرف تو ہندوستان کو تقسیم کرنے والی سامراجی اور سرمایہ دارانہ استحصال کی طاقتوں کے خلاف سیسہ پلائی دیوار ثابت ہوئی اور دوسری طرف ملک میں معاشی انقلاب لانے میں کروڑوں افراد کی معاون طاقت بنی ہوئی ہے۔ یہ وہی دھارا ہے جس کی رہنمائی مفکرِ ملت ضیاء الرحمٰن انصاری کر رہے ہیں۔

اقبال کی فکر اور مولانا کی عملی جدوجہد دونوں کی یکسانیت کا تقاضا عاصم بہاری پبلیکیشنز بورڈ کی شکل میں پورا ہونا ایک قدرتی امر تھا جو آج آپ کے سامنے ہے۔

"اسرارِ اقبال" حسین مہدی رضوی صاحب کی وہ کاوش ہے جو اقبال کے پیغامِ خودی کو ہندوستانی عوام کے سامنے اردو میں عام کرنے کا ذریعہ بنے گی اور جسے عاصم بہاری پبلیکیشنز مطلعِ ادب پر لا رہا ہے۔

اس پبلیکیشنز بورڈ کی صدارت قبول کر کے محترم ضیاء الرحمٰن انصاری صاحب ڈپٹی منسٹر حکومت ہند نے اپنی ادب پروری کا ثبوت دیا ہے جس کے لیے ہم ان کے مشکور ہیں۔ انشاء اللہ بورڈ اپنی کوششوں میں برابر منہمک رہے گا اور علامہ اقبال پر اپنی دوسری پیش کش بہت جلد منظرِ عام پر لانے والا ہے۔

عبدالماجد ادیب انصاری
سکریٹری
عاصم بہاری پبلیکیشنز بورڈ۔ مرادآباد

عاصم بہاری پبلیکیشنز اور "اسرارِ اقبال"

از جناب ضیاء الرحمٰن انصاری صاحب
نائب وزیر، صنعت و رسد عامہ حکومتِ ہند
صدر آل انڈیا مومن کانفرنس

مولانا عاصم بہاری مرحوم ایک بلند پایہ مقرر۔ ایک قوم پرور لیڈر اور مصلح ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ستھرا ذوقِ شعری رکھنے والی ادب نواز شخصیت بھی تھے۔ مولانا کی یاد کو تازہ رکھنے اور ان کے مشن کو عوام تک پہنچانے کے لیے مراد آباد کے چند اہلِ فکر حضرات نے مولانا کے نام پر ایک ادارہ "مولانا عاصم بہاری میموریل سوسائٹی اتر پردیش" کے نام سے حکومت یو۔ پی سے رجسٹرڈ کرایا ہے جس کا پہلا قدم تعلیم کا فروغ ہے۔ اس کا ایک ذیلی ادارہ "عاصم بہاری پبلیکیشنز" بھی ہے جس کے مقاصد میں سنجیدہ ادباء و شعراء کی غیر مطبوعہ تصانیف کی اشاعت شامل ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ ادارہ اپنے مقاصد میں نمایاں کامیابی حاصل کریگا جناب محمد ظہیر انصاری اور مسٹر عبد الماجد ادیب انصاری جن کی مساعی جمیلہ اس ادارے کے قیام کا ذریعہ بنیں لائق مبارک باد ہیں۔

"اسرارِ اقبال" اس ادارے کی پہلی پیش کش ہے۔ یہ علامہ اقبال کی فارسی مثنوی "اسرارِ خودی" کا منظوم ترجمہ ہے۔ اسرارِ خودی کے چھپتے ہی دنیا کو اس کے ترجمے کی ضرورت محسوس ہو گئی تھی اور اکثر زبانوں میں اس کے

ترجمے ہو چکے ہیں۔ ہندوستانی زبان میں اس کے ترجمے کی ضرورت کا احساس جناب حسین مہدی رضوی صاحب نے کیا اور اس کمی کو بخوبی پورا کر دیا۔ ان کی اس کوشش سے علامہ اقبال کی فارسی مثنوی اردو کے قالب میں ڈھل کر ہمارے شعور کو دعوتِ فکر و نظر دے رہی ہے۔

علامہ اقبال ہندوستان کی اُن معدودے چند عظیم شخصیتوں میں سے ایک ہیں جو اپنے ہم وطنوں کو خود نگر و خود گر و خود گیر رہنے اور عزتِ نفس کو محفوظ رکھنے کا سبق دیتے ہیں۔ وہ ایسی خودی پیدا کرنا چاہتے ہیں جو کسی ایک منزل پر نہ ٹھہرے اور جس کی یلغار زمان و مکاں کے سارے حدود توڑ کر آگے بڑھ جائے۔ اُن کے نزدیک حقائق کی دنیا خودی کی منزلِ اولیں ہے جس کو نشیمن نہیں سمجھنا چاہیے اور اپنی یلغار جاری رکھنی چاہیے۔

خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں — مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں — جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر — طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا — تری شوخیِ فکر و کردار کا

وہ ہندوستان کے ذرّے ذرّے سے محبت کرتے تھے۔ ان کے بقول:-

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز — اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
اس خاک سے اُٹھے ہیں وہ غوّاصِ معانی — جن کے لیے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب

لیکن جب ان کی نظر سیاستِ افرنگ اور مغربی طرزِ معاشرت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہندوستان پر پڑتی تو ان کا احساس ایک خاص قسم کی چبھن محسوس

کرتا اور وہ اپنے اہلِ وطن کے تعطل و جمود پر گریہ کرتے تھے۔

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب

بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب

اُن کے لیے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی چنانچہ وہ جوشِ کردار کے ذریعہ جذب و تسخیر کی صلاحیت پیدا کرنے کی دعوت دیتے ہیں اس لیے کہ جس جماعت میں جذب و تسخیر کی صلاحیت پیدا ہو جائے جو اس کے جوشِ عمل کی آئینہ دار ہوتی ہے تو اس کے غلبہ و تسلط کو دنیا کی کوئی رکاوٹ نہیں روک سکتی۔ وہ اپنے جوشِ کردار اور احوال صالحہ سے اپنی تقدیر کے راز معلوم کر سکتی ہے۔

ساز ہے راز ہے تقدیرِ جہاں تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع
کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز

صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر
جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز

اسرارِ خودی اُن کی اس قسم کی مثنوی ہے جو دنیا سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے اور جس کے لیے ڈاکٹر ملک راج آنند نے کہا تھا کہ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر (اقبال) آزاد روح اور وسیع نظر رکھنے والے انسانوں کا سچا عاشق ہے نیز کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر نکلسن نے کہا تھا کہ اقبال کا جدید اور فیض رساں سرود عنقریب الہامی آواز کی حیثیت اختیار کرنے والا ہے مجھے بے حد مسرت ہے کہ عاصم بہاری پبلیکیشنز کے ذریعہ اقبال کی یہ آواز "اسرارِ اقبال" کے لہجے میں بلند ہو رہی ہے۔

(ضیاء الرحمٰن انصاری)

صدر۔ عاصم بہاری پبلیکیشنز بورڈ، مراد آباد

۵ر نومبر ۱۹۷۵ء

"سر محمد اقبال کی شاعری
آفاقی قدروں کی حامل ہے"

(گرو رابندر ناتھ ٹیگور)

"... بہر نوع اقبال کی تعلیمات کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اس نے دُنیا کے غریبوں کو جگانے کے لیے جرس کا کام دیا اور فیض جیسے جانے کتنے نوجوان اس کے سہارے انقلاب کی راہِ راست پر آ نکلے ....."

(ڈاکٹر محمد اشرف)

باسمہٖ

پیش لفظ

از علامہ امتیاز علی صاحب عرشی

نوائے سروش اور حریم کارشتہ غالب جانیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ دبدبان کی جب بے باک ترنگ نے انہیں یہ کہنے پر مجبور کیا تھا کہ :-

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے ، انفعال
حاصل نہ کیجیے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

شاید اسی نے اقبال سے اسرار خودی تصنیف کرائی اور ماوراء النہری مغل بچے کے یہاں جو مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا وہ اس مستعد جہاز کشمیری برہمن زادے کے ہاتھوں پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا

سرسید کے حوالے سے سر عبدالقادر نے لکھا ہے کہ عالم کی روح عالم بالا میں بے چین تھی کہ ایسے اقبال کی مشکل ہے۔ پھر یہاں آگئی۔ غالب نہ ہوتے تو اقبال ڈھونڈے سے نہ ملتے اور اقبال نہ ملتے تو غالب نامکمل رہتے کیونکہ جو بندگی میں تھے آزاد و خود بیا ہو کر :

اٹھے پھر آئے ، در کعبہ اگر وا نہ ہوا
وہ زندگی ہی کیسے نہ ہو تب سے کہ ہو

زرا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبال نے اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن پر جو دیباچہ تحریر کیا تھا اس میں یہ وضاحت تھی کہ خودی اس مفہوم کی حامل اصطلاح نہیں ہے جو خود رائی اور خود ستائی جیسی اصطلاحوں میں پایا جاتا ہے، تو پھر خودی کیا ہے؟ کیوں ضروری ہے؟ اجمالاً اس کا جواب یہ حدیث ہے۔

من عرف نفسہٗ فقد عرف ربّہٗ

(جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے ربّ کو پہچانا)

اور تفصیل کے لیے اقبال کی دنیائے نظم و نثر میں سے اُن کی مثنوی اسرار خودی" کلیدی حیثیت کی مالک ہے۔

اقبال کی اس تصنیف کو دُنیا نے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور شاید ہی کوئی اہم زبان ایسی ہو جس میں اس کا ترجمہ نہ ہوا ہو۔ ایک عرصے سے اس کے اُردو ترجمے کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ حسین مہدی رضوی صاحب نے صرف ترجمے ہی پر اکتفا نہ کی بلکہ اس فارسی نظم کو اُردو مثنوی میں تبدیل کر کے بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا ہے۔ مہدی صاحب پر اس جوئے شیر لانے میں کیا بیتی ہوگی اُس کو نظر میں رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس مہم کے سر کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

اقبال نے اسرارِ خودی کو فارسی میں لکھنے کی مصلحت یہ بیان کی تھی کہ:-

گرچہ ہندی در عذوبت شکر است — طرز گفتار دری شیریں تر است
فکر من از جلوہ اش مسحور گشت — خامۂ من شاخ نخلِ طور گشت

پارسی زد رفعت اندیشہ ام — درخورد با فطرتِ اندیشہ ام

معلوم ہوتا ہے کہ مہدی صاحب نے اس عزم کے ساتھ کام شروع کیا تھا کہ وہ ہمیں فارسی کی سی حلاوت پیدا نہیں کر سکے تو ترجمہ اردو کی پیشرفت سے رہ جائے۔ اگرچہ کسی زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا بڑا مشکل کام ہے لیکن آپ مندرجہ ذیل فارسی اشعار کیجئے ان کا اردو ترجمہ پڑھیے:۔

شب چو بر مہتاب زد — لٹ گئے جب اس شب کے گہر

گریۂ من بر رخِ گل آب زد — میرے آنسو نے تیرے گل کو تب تر

[illegible] — میرے [illegible] بگیس [illegible]

[illegible] — جاگ [illegible] مری زیادے

بود نقشِ ہستیم انگارۂ! — میرا نقشِ ہستی اک انگارہ تھا

ناقبولے ناکسے ناکارۂ — ناقبول و ناکس و ناکارہ تھا

عشق سوہاں زد مرا آدم شدم — عشق کی سوہاں سے میں آدم ہوا

[illegible] — عالم کیف و کم عالم ہوا!

حرکتِ اعصابِ گردوں دیدہ ام — حرکتِ اعصابِ گردوں دیکھ کر

در رہِ گردش خاں دیدہ ام — چاند میں بھی گردش خوں دیکھ کر

[illegible] — راتوں انسان کے لیے رویا کیا

تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست — زندگی کا راز آخر پا لیا!

[illegible] — کھولا بابِ کارگاہِ ممکنات

[illegible] — [illegible]

خامہ ام از ہمتِ فکر بلند — فکرِ عالی سے قلم ہے تیز گام
رازِ ایں نہ پردہ در صحرا فگند — رازِ نہ افلاک کھلتے ہیں تمام
قطرہ تا ہمپایہ دریا شود! — تا کہ قطرہ ہمسرِ دریا بنے!
ذرہ از بالیدگی صحرا شود — ارتقا سے ذرہ بھی صحرا بنے

تمہید

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است — بس خودی کا اک اثر ہے یہ شہود
ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است — اصل شے سرِ خودی کی ہے نمود
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد — جب خودی نے خود کو چونکایا ذرا
آشکارا عالمِ پندار کرد! — عالمِ پندار ظاہر کر دیا
صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او — سو جہاں پنہاں ہیں اسکی ذات میں
غیرِ او پیداست از اثباتِ او — اس کی ضد ہے اس کے ہی اثبات میں
در جہاں تخمِ خصومت کاشت است — اس نے یہ طرزِ جدل ایجاد کی
خویشتن را غیرِ خود پنداشت است — خود سمجھ بیٹھی ہے خود کو اجنبی
(اصلِ نظامِ عالم از خودی ست ....)

ہمت از حق خواہ و با گردوں ستیز — حق کی ہمت پہ فلک کو آزما
آبروئے ملتِ بیجنا مریز — سر نہ جھکنے پائے تیری قوم کا
(خودی از سوال ضعیف می گردد ....)

از حقیقت با زبانم درمے — کرتا ہوں ظاہر حقیقت کی نئی
باتوی بہ حدیثِ دیگرے — اب سناتا ہوں کہانی دوسری

گفت با الماس در معدن زغال — کان میں ہیرے سے بولا کوئلہ
اے امینِ جلوہ ہائے لازوال — تو امیں ہے لازوال انوار کا

ہمچو ہم دست وجودِ یکیست — ہم ہیں ہمدم ایک کی ہے ہست بود
در جہاں ضمِ وجودِ ما یکیست — ایک ہے در اصل دونوں کا وجود

من بکاں نیم مزدورِ دنا کسی — میں یہاں مرتا ہوں ٹھکرایا ہوا
تو سرِ تاجِ شہنشاہاں رسی — تاجِ شاہی سے ترا رشتہ ہوا

قدرِ من از بندگی بدتر ز خاک — قدر [illegible] خاک
از جمالِ تو دلِ آئینہ چاک — حسن سے تیرے دلِ آئینہ چاک

روشن از تاریکیِ من انجم است — نورِ آتش داں میں ہیرے خال و خد
بس کمالِ جوہرم خاکستر است — [illegible] جوہر کی حد

(از حکایتِ الماس و زغال .....)

شیخ با برقِ سلطان ما است — شیخ نے زر درہم بخش دو
آنکہ در چہرا ایں شاہی گدا است — جامۂ شاہی [illegible] کو

حکمرانِ مہر و ماہ و انجم است — [illegible] ہے
شاہِ ما مفلس ترینِ مردم است — [illegible] جاتے ہے

[illegible] — [illegible]
آتشِ [illegible] — بھوک سے [illegible] گئی

(مقدمیاتِ مسلم اعلائے کلمۃ اللہ [illegible] .....)

علمِ حق را در قفا انداختی
علمِ حق تیری نظر سے گر گیا

بہرِ نانے نقدِ دیں در باختی
نقدِ دیں روٹی کی خاطر دے دیا

گرم رو در جستجوئے سرمہ
جستجوئے سرمہ میں ہے دربدر

واقف از چشمِ سیاہِ خود نہ
اپنی آنکھوں کی سیاہی بھول کر

آبِ حیواں از دمِ خنجر طلب
مانگ اب خنجر سے آبِ زندگی

از دہانِ اژدہا کوثر طلب
اژدہے کے منہ سے کوثر کی نمی

(اندر زمیر نجات نقش بند ....)

در گلِ خود تخمِ ظلمت کاشتی
تخمِ ظلمت اپنے دل میں بو دیا

وقت را مثلِ خطے پنداشتی
وقت کو بھی ایک خط سمجھا کیا

باز با پیمانۂ لیل و نہار
لے کے پھر پیمانۂ لیل و نہار

فکرِ تو پیمودِ طولِ روزگار
ناپنے بیٹھا ہے طولِ روزگار

(الوقتُ سیفٌ ....)

مجھے یقین ہے کہ آپ بھی مہدی صاحب کے بہت سے اُردو اشعار کو قابلِ داد قرار دیں گے کسی منظوم ترجمے کے بارے میں یہ توقع کرنا کہ وہ سب کا سب، اصل متن کا ہم پلہ ہو گا ترجمے دراصل کے فرق کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔ اگر ترجمہ بحیثیت مجموعی اصل کے آس پاس پہنچ جائے تو اسے ترجمے کی خوبی کہا جائیگا۔ مہدی صاحب کے اردو شعر میں یہ خوبی پوری طرح موجود ہے۔

اس منظوم ترجمے کی تمہید میں مہدی صاحب نے جو تحریر فرمایا ہے وہ ترجمے سے کم اہمیت کا نہیں۔ اس تمہید کی مدد سے اقبال کی پوری فکری شاعری کو سمجھنا اور "اسرارِ خودی" کو سمجھنے میں خصوصاً بڑی مدد ملے گی

خدا کرے مہدی صاحب کی یہ سعی مشکور و مقبول ہو۔

۱۹ مارچ ۱۹۷۵ء

امتیاز علی خاں

معروضات و محسوسات

علامہ اقبالؒ کی نظم و نثر کے بارے میں تنا لکھا اور کہا گیا ہے کہ اس میں نئی بحث سے اقبال کے صحیح مقام کی نشان دہی مشکل ہے۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ صاحبانِ فکر و نظر اس کے ساتھ کیا معاملہ اور اقبال شناس اس سے کس سلوک کریں گے

علامہ نے سرِ خودی کی تمہید میں کہا تھا کہ :-

خود دگر بین گہے اے ہوش مند — دل بہ ذوقِ غردۂ مینا ببند
فکر چیزے شکل مینا بر مگر — لطف صہبا سے تھا اے دیدہ ور

میں بھی اس کے علاوہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اگر میری کوتاہیوں کو دیکھنے کے باوجود یہ مضمون کسی نئے موضوع سے نئی فہم و فکر کو اچھی فال لے پائے، تو کتاب سرِ خودی کے تقریباً ایک ہزار اشعار کا منظوم ترجمہ کیا جا رہا ہے اور مقدمہ کے بطور ہر باب پر مختصر تبصرہ سرِ خودی کو سمجھنے میں مدد دے گا۔

جو شی، ذیلی مضمون کی شکل میں نہیں بلکہ کتاب کے آخر میں پیش کئے گئے ہیں۔ کتاب کے ان مضمونوں کا ترجمہ نہیں کیا گیا جو انگریزی اشعار سے متعلق ہیں۔ اقبال کے سمجھے جانے انہیں دو بیان میں تحریر کیا گیا ہے۔ دو ایسے ہیں جن کا تذکرہ ایک شعر میں نہیں بلکہ دو شعروں میں ہوا ہے

اشہیر تو سبین میں لکھا گیا ہے۔

میں علامہ کے تصورِ خودی پر اب تک تین کتابیں مکمل کر سکا ہوں۔ مزید دو کتابیں ابھی لکھنی ہیں۔ "رموزِ اقبال" (تبصروں کے ساتھ) "رموزِ بے خودی" کا منظوم ترجمہ اور "خودی" ۔ ابتدا سے اقبال تک علامہ کے مختلف طرزِ فکر "خودی" کو اجاگر کرنے کے لیے لکھی گئی ہیں جو انشاء اللہ جلد تین برس کی مدت میں مکمل کروں گا معروضات ختم کرنے سے پہلے یہ اظہار کرتا چلوں کہ اس تربیت کی ضرورت کیا تھی؟ آدمی کو کچھ بھی جاننے سے پہلے خود کو پہچاننا چاہیئے۔ یہ کام نہیں کارنامہ ہے جو آسانی سے انجام نہیں پاتا۔ بنائے آدم نے آج تک اس سے زیادہ بعید از حقیقت بات کوئی اور نہ کہی ہوگی کہ "ہم خود کو پہچان چکے ہیں" معدودے چند کو چھوڑتے ہوئے دراصل ہم سب مرنے دم تک اپنی کارزائی شناخت میں منہمک رہتے ہیں لیکن کہنے سننے کے قابل ہوتے ہی سمجھنے لگتے ہیں کہ خود کو پہچان چکے ہیں۔ یہ خود فریبی نہیں تو کیا ہے؟ اب اگر حقیقت شناس ہونا فریب کھانے سے بہتر ہے تو خود شناس ہونا لازم جو خودی کی حقیقت سمجھے بغیر ممکن نہیں اور اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے اقبال کی ان تصانیف کا مطالعہ ضروری ہے جن کا منشا ہی خودی کی بلند بانگ تکرار اور اس کی ماہیت سمجھنے پر جائز اصرار ہے۔

آج سے دس بارہ برس پہلے میں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ اگر آدمی کو انسان بننا ہے تو اسے علامہ کے تصورِ خودی کو اپنانا ہوگا لیکن اس مشکل کا حل مجھ میں نہ آتا تھا کہ میرے ہم وطن اس تصور کو کیسے اپنائیں گے جب کہ علامہ نے

خودی کے بارے میں مرلوبہ ڈھنگ سے جو کچھ کہا ہے وہ سچی یا انگریزی
میں ہے۔ جو کچھ اس میں خودی اور روز بے خودی کے نتیجے کی حوالے سے ہو
وہ بھی سامنے در نہیں جا سکتا جس کی کسی کرنی اور اقبال کی تحریر سے ہے

خرد نے دور تک دیدیں است این کہ ما
بہ ہر نشیب و فراز دانا نوشتہ ایم

یہ شعر سب دوستوں اور رشتہ داروں کو معلوم تھا جس مجلس نے اس کا
کوئی بھی تکمیل کیا ہے میری مدد کی۔ ان میں میری بہن عزیزہ سلمیٰ کے نام کو
خصوصی طور پر قابل ہے۔ انہوں نے ان حالات میں میری حوصلہ افزائی کی جو یہ سے
حالات سے کہیں زیادہ پریشان کن اور صبر آزما تھے۔ چھ ایسے کہ ان پر کوئی
کسی کی مدد نہ کر سکے اور کر رہا ہے ہم بھول جائے۔

اس وقت میرے سامنے ایک ایسے دوست کا چہرہ بھی ہے جو اردو نہیں جانتے
تھے لیکن یہ کتاب دیکھنے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ ان کے انتقال سے کچھ
دن پہلے انہوں نے کہا تھا۔

"مہدی صاحب! جب اردو پڑھتے ہیں اقبال کی شاعری کو
ہمارے دوست کی ہو گئی ہیں تو بس اسی کی ہو گئی ہے۔"

بہت سے دوست پنڈت کیدار ناتھ دوے اپاڈھیائے۔
کاش وہ اس کتاب کو دیکھ سکتے۔

حسین مہدی رضوی

نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تیغِ اصیل

سوانحِ اسرار

	صفحہ	مثنوی
اقبال کا تصور خودی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	۱۷	
قدر آفرینِ انا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔	۱۹	
درجاتِ انفرادیت	۲۰	
خدا ۔ خودی اور آدمی	۲۳	
ابلیس ۔ آدمی کی خودی کی شہادت	۲۶	
خودی کے دوست اور دشمن	۳۰	
اسرارِ خودی ..... مقدمات و تنقیدی		
پہلا باب ۔ تنبیہ	۳۱	۹۹
دوسرا باب ۔ اصل نظام عالم خودی ہے اور سلسلۂ حیات تعینات خودی کا انحصار استحکامِ خودی پر ہے	۳۶	۱۰۶
تیسرا باب ۔ حیاتِ خودی تخلیق و تولید مقاصد سے	۳۸	۱۰۹
چوتھا باب ۔ خودی عشق و محبت سے مستحکم ہوتی ہے	۴۲	۱۱۱
پانچواں باب ۔ خودی سوال سے ضعیف ہوتی ہے	۴۵	۱۱۵
چھٹا باب ۔ جب خودی عشق و محبت سے مستحکم و بالغ ہو تو نظمِ عالم کی تمام طاقتیں اس کو مسخر کر لیتی ہیں	۴۷	۱۱۶
ساتواں باب ۔ حکایت ۔ جس معنی میں یہ سلسلہ کی خودی خطاب فرشتوں کی اختیار سے ہے اس معنی میں ابلیس سے خطاب فرشتوں کے ملائکہ کا ہوتی ہے	۵۰	۱۱۹
آٹھواں باب ۔ فرشتوں کو انسان کی حیثیت ۔ ۔ ۔ کے تصور ۔ ۔ ۔ علامہ بہت مناسبت ۔ ۔ ۔ مسلمان کو عقیدہ ۔ ۔ ۔ اس کے مختلف ۔ ۔ ۔	۵۲	۱۲۴

	۵۶	نو فلاطونیت
۱۲۵	۶۱	نواں باب۔ حقیقت شعر اور اصلاح ادبیات اسلامیہ
۱۳۱	۶۴	دسواں باب۔ تربیت خودی کے تین مرحلے تین بتوں کا نام الٰہ ہے دوسرے کا ضبط نفس اور تیسرے مرحلے کا نام نیابت الٰہی ہے۔
۱۳۷	۷۰	گیارھواں باب شرح اسمائے علی مرتضیٰ رض
۱۴۱	۷۲	بارھواں باب حکایت۔ ہند کا ایک نوجوان حضرت مخدوم علی ہجویری کی خدمت میں آیا اور دشمنوں کے ظلم کا شکوہ کیا۔
۱۴۳	۷۵	حکایت۔ اس چڑیا کی جو پیاس سے بے تاب تھی۔
۱۴۵	۷۵	ہیرے اور کوئلے کی کہانی
۱۴۷	۷۶	تیرھواں باب۔ حکایت شیخ و برہمن اور مکالمہ گنگا و ہمالہ اس معنی میں کہ روایات مخصوصہ طبع پر گرفت مضبوط رکھنے سے حیات ملیہ کا تسلسل برقرار رہتا ہے۔
۱۵۰	۷۹	چودھواں باب۔ مسلمان کی حیات کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے اور وہ جہاد جس کی محرک ہوس ملک گیری ہو مذہب اسلام میں حرام ہے
۱۵۳	۸۳	پندرھواں باب۔ میر سید نجات نقش بند المعروف بہ بابائے صحرائی کی نصیحت جو ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے تحریر کی گئی۔
۱۵۸	۸۷	سولھواں باب۔ امت و سیف (وقت آرائے)
۱۶۳	۹۳	دعا۔
۳۷		ایک وضاحت
۱۶۹		حاشیے اور حوالے

اقبال کا تصورِ خودی

وجود کیا ہے فقط جوہرِ خودی کی نمود

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریِ کائنات

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

اندھیرے اُجالے میں ہے تابناک
من و تو سے پیدا من و تو سے پاک

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی
دمادم نگاہیں بدلتی ہوئی

سُبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں

عدم اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقدیم کا راز ہے

کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں
یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

اسے واسطہ کیا کم و بیش سے
نشیب و فرازِ دروں پیش سے

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

علامہ اقبال کے تصور کے بموجب "خودی کی لطافت مشاہدے کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی"[۱] اس کی حقیقت مضمر ہے۔ وحدت وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ کہنے کے علاوہ وہ اسے کہیں شرارِ زندگی اور کہیں نور کا نقطہ[۲] بھی کہتے ہیں۔ اُن کی بتائی ہوئی تعریف کے مطابق "خودی ایک باہوش تخلیقی قوتِ ارادی ہے جو انسان اور کائنات کے دیگر افراد کو اُن کے کارہائے منصبی کی تکمیل کے لیے ارتقاء کی راہ پر لگائے رکھتی ہے"[۳]

اقبال کے بقول زندگی کی حقیقت تفرد ہے۔ عالم گیر زندگی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ افرادِ کائنات کی تعداد بھی معین نہیں بلکہ ہر روز نئے افراد کا اضافہ ہوتا رہتا ہے[۴]۔

تخلیق کا سرچشمہ ایک وجودِ بسیط ہے جس میں ادراک اور ارادے کی معروف اور محکم قوتیں موجود ہیں۔ اُن کے نفاذ کے لئے وجود "خود" اور "غیر خود" میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ "غیر خود" کو "خود" کا آئینہ سمجھنا چاہیئے۔ جس میں "خود" اپنا نظارہ کرتا ہے اور یہی "غیر خود" وہ نصب العین بھی ہے جو خودی کی کارفرمائی کے لئے اس کے سامنے رہتا ہے ..... اُس کارفرمائی کے لئے سامنے رہتا ہے جو "خود" کو ارتقا کی طرف بڑھاتی ہے[۵]۔

تخلیق کا یہ سرچشمہ، یہ وجودِ بسیط ہی "خودی" ہے۔ یعنی وہ ایک باہوش تخلیقی قوتِ ارادی جو کائنات انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ کائنات کے ہر فرد کی ہادی بھی ہے اور ناظم و نگراں بھی، اور یہی کائنات کے ذرّے ذرّے میں کارفرما ہے۔

کا زمانی کے اعتبار سے خودی کو انائیت کہا جا سکتا ہے جس کا
نمبر دیگر افرادِ کائنات کی نسبت آدمی میں زیادہ نمایاں ہے

قدر آفریں انا اور مؤثر انا[1]

اقبال کے بقول انائیت کے دو انداز ہیں۔ ایک قدر آفریں اور دوسرا مؤثر۔ مؤثر انداز وہ ہے جس کے باعث خودی خارجی عالم سے بقا پیدا کرتی ہے۔ اس انداز کی حیثیت مکانی ہے۔ یعنی ہمارے روال دوال شعور کی کیفیات پر عالم مکانی کے تصورات ثبت ہو جاتے ہیں۔ ان تاثرات میں خودی اپنی معنوی وحدت برقرار رکھتے ہوئے مختلف انداز کے ذریعے اپنا اظہار کرتی ہے۔ زمانی رُخ پر انائیت کے اس عمل کا تعلق اس وقت سے ہے جس میں طوالت اور اختصار کا احساس موجود رہتا ہے۔ یہ زمان یا وقت ایک قسم کا خطِ مستقیم ہوتا ہے جسے مختلف نقطے ہوئے مکانی اجزاء پر مشتمل سمجھنا چاہیے، لیکن اگر ہم شعور کے تجربے کا اور گہرا جائزہ لیں تو ہمیں انائے قدر آفریں کا پتا ملتا ہے۔

انائے قدر آفریں کی نوعیت کیفی ہے۔ اس میں جو تغیر و حرکت پائی جاتی ہے وہ غیر منقسم ہوتی ہے اور اس میں زمانی توالی نہیں ہوتا۔ اس کا زمان دراصل ایک آن واحد ہے جس کو انا خارجی عالم سے واسطہ رکھنے کے باعث مسلسل انفرادی آنات میں تقسیم کرتی ہے۔ جیسے ایک دھاگے

میں موتی پروئے ہوئے ہوں۔

انائے قدر آفریں کی نوعیت کیفی اور داخلی ہونے کے باعث اس کی وحدت کو اس بیج کے مانند تصور کیا جا سکتا ہے جس میں اس کی گزشتہ کیفیتوں کے وہ تجربے پوشیدہ ہوں جو اپنی گوناگونی کے باوجود ایک وحدت سے عبارت ہوتے ہیں اور ہر تجربہ کل میں اس طرح سرائت کئے ہوتا ہے کہ اس کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔[1]

درجاتِ انفرادیت

اس تصور کو اپنا لینے کے بعد کہ "ہر شے انفرادیت کی حامل ہے" یہ مرحلۂ فکر سامنے آتا ہے کہ بہ صحتِ اظہار "فرد" کسے کہا جائے۔ برگساں نے اپنے نظریۂ "ارتقائے ظہوری"[2] میں بتایا ہے کہ انفرادیت دراصل درجات کا معاملہ ہے، کیوں کہ اس کی مکمل شناخت تو وجودِ انسانی جیسے "واحدۂ سرکشیدہ"[3] میں بھی نہیں ہو سکتی۔ اس فلسفی کے بقول انفرادیت کے بارے میں بس یہ کہا جا سکتا ہے کہ عضوی طور پر منظم کائنات میں منفرد رہنے کی صلاحیت ہر جگہ پائی جاتی ہے جس کی دائمی حریف "باز آفرینی" ہے اور باز آفرینی کیا ہے؟ پرانے جزو سے کسی نئے جزو کی تعمیر، مگر انفرادیت کی تکملیت[4] کے لئے تو ضروری ہے کہ وجود کا کوئی ٹوٹا ہوا حصہ الگ زندہ نہ رہ سکے۔

اب مقام پر یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ انفرادیت اپنے دشمن یعنی بازآفرینی کو اپنی ہی گود میں پروان چڑھاتی ہے[۱]

اب چونکہ خودی کا کردار ہی یہ ہے کہ وہ اپنے مرکز سے بڑھ کر بیرونی وسعت پر پھیلاؤ اختیار کرے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ "حیاتِ انانیت" قدر آفرینی سے موثریت کی طرف حرکت سے عبارت ہے[۲] لہٰذا خودی جب اپنے مرکز سے دور ہٹتی جاتی ہے، بے شمار درجاتِ انفرادیت بہ ہمہ متعلقات تعمیری و تخریبی رونما ہوتے چلے جاتے ہیں[۳]۔ بہ ایں ہمہ خودی کی مربوط کلیت ختم نہیں ہوتی۔ اس سمجھنے کیلئے یہ جان لینا ضروری ہے کہ اگر ہم تخلیق کی حرکت کو باہر سے دیکھیں، اس کا ذہنی تجزیہ کرنا چاہیں تو ہزارہا سال درکار ہوں گے، جن میں بے شمار درجاتِ انفرادیت سامنے آئیں گے، لیکن اسی عملِ تخلیق کو جب ایک "امر" کے بطور سمجھا جائے گا تو یہ ایک غیر منقسم عمل معلوم ہوگا۔ جو اس قدر تیزی سے انجام پاتا ہے جیسے پلک کا جھپکنا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھا جائے کہ طبیعیات کے رو سے ہم جانتے ہیں کہ ہمیں سرخ رنگ کا احساس اس کی حرکتِ موجی کی تیزی کے باعث ہوتا ہے جس کا تعدد ایک سیکنڈ میں چار سو کھرب ہے۔ بیرونی طور پر اگر ہم اس کا شمار کرنے بیٹھیں اور دو ہزار فی سیکنڈ یعنی ادراکِ نور کی حد کے مطابق گنتا جاری رکھیں تو یہ شمار چھ ہزار برس سے بھی زیادہ میں ختم ہوگا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمیں سرخ رنگ کا احساس آنِ واحد میں ہو جاتا ہے اور بیشمار ارتعاشات کو ایک ساتھ ایک آن کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ بس یہی وہ انداز ہے جس سے ذہن زمانِ ممتد کو دوران میں تبدیل کر دیتا ہے اور یوں انائے قدر آفریں انائے

مؤثر کی کوتاہیوں کو دور کرتے ہوئے زمان و مکاں کے تغیرات کو شخصیت کی مربوط کلیت میں تبدیل کر دیتی ہے[۱]۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اپنے مرکز میں خودی کا درجہ ایک قدر آفریں اور معین وجود کے بطور ہے جس کے منفرد ہونے کا احساس ہمیں کائنات میں نیچر کے توسط سے اور اپنے شعور میں ذہن کے ذریعہ ہوتا ہے۔ برگساں کے بقول "جب میں اپنے شعوری مشاہدے پر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک حالت سے گزر کر دوسری میں پہنچتا رہتا ہوں۔ میں ٹھنڈا ہوتا ہوں یا گرم، خوش ہوتا ہوں یا افسردہ۔ کام کرتا ہوتا ہوں یا بے کار۔ اردگرد کے نظارے میں منہمک ہوتا ہوں یا کسی خیال میں محو۔ احساسات، جذبات، ارادے، خیالات کچھ ایسے تغیرات ہیں جن میں میرا وجود بٹا ہوتا ہے اور جو میرے وجود کو یکے بعد دیگرے رنگتے رہتے ہیں۔ میں بدلتا رہتا ہوں، لیکن مٹتا نہیں۔ میری داخلی زندگی میں اگرچہ ساکن کچھ بھی نہیں بس ایک دائمی بہاؤ ہے۔ ایک مستقل روانی یا احوال کا جاریہ تغیرات ہے، لیکن میں اس عالم میں تقسیم نہیں ہوتا۔ میرا کوئی جزو مجھ سے ٹوٹ کر الگ زندہ نہیں رہتا کہ میری متحرکیت کا نقش بنے بلکہ مجھ میں ہی موجود رہتا ہے[۲]۔ بالکل اسی طرح جیسے ایٹم کے قلب میں کوئی شے کبھی نہیں ٹوٹتی، کبھی تقسیم نہیں ہوتی صرف بدلتی ہے اور کچھ ایسے کہ ابھی بدلی اور ابھی پھر وہی کی وہی ہو گئی۔ گویا پلک کی جھپک کہ ابھی آنکھ نابینا تھی اور ابھی بینا ہو گئی بلکہ اس حقیقت کے بلیغ اظہار کے لئے اندر دو عالم کا یہ قول دوبرا نا بجا ہے

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ۝[۳]

(یقیناً ہم نے ہر شے ایک قدر کے مطابق خلق کی اور ہمارا امر بس ایک ہے۔ جیسے پلک کا جھپکنا۔)

خدا۔ خودی اور آدمی

خدا ایک فرد ہے اور یکتا ہے[1] اس فردِ یکتا کی خودی، اساسی اور قائم بالذات ہے[2] قرآن مجید اس کے تشخص کو ذہن نشین کرانے کے لئے اسے اللہ کہہ کر پکارتا ہے اور اس کی تعریف اس طرح بیان کرتا ہے:-

کہہ! وہ اللہ ایک ہے۔

اللہ بے نیاز ہے

اس سے کسی کی ولادت نہیں ہوئی۔

نہ اس نے کسی سے ولادت پائی

اور کوئی اس جیسا نہیں ہے[3]

اُس بے مثل ذات کی خودی اور کائنات کی خودی میں کوئی مشابہت نہیں ہے کیوں کہ:-

خداوند تعالےٰ ہمیشہ سے موجود ہے، مگر حادث و نو پید نہیں۔ وہ ہر شے کے ساتھ ہے، لیکن بطور ہمسر نہیں۔ وہ ہر چیز سے الگ ہے۔ لیکن اس سے کنارہ کش نہیں۔ وہ ہر چیز کا فاعل ہے، لیکن اس کا فعل حرکات و آلات کا نتیجہ نہیں۔ وہ بصیر ہے جب اس کی مخلوق نہ تھی۔ وہ منفرد ہے کیوں کہ اس کا کوئی ساتھی ایسا نہیں جس سے وہ اپنا جی بہلائے

اور جس کے نہ ہونے سے اُسے اُلجھن ہو۔ اُس نے دنیا کو پیدا کیا اور پہلے پہل بنایا بغیر اس کے کہ فکر کو کام میں لاتا یا تجربے سے فائدہ اُٹھاتا۔ نہ اپنے نفس میں حرکت پیدا کی اور نہ پہلے سے کوئی اہتمام کیا جس کے لئے بے چین ہوا ہو۔ وہ چیزوں کو ٹھیک وقت پر عدم و نیستی سے وجود کی طرف لایا اور گوناگوں چیزوں میں موافقت پیدا کی۔ ہر چیز کو اس کی طبیعت اور مزاج عطا کیا اور اُن طبائع کے لئے شکل و صورت معیّن کی لہ

لاریب وہ یکتائی کے اعتبار سے "احد" ہے کیوں کہ اس کی ذات کو صفات سے کبھی نہیں ملایا جا سکتا[۲] اور درجاتِ انفرادیت کے اعتبار سے "اعلیٰ" ہے کیوں کہ اس کے مرتبے سے بلند مرتبہ کسی کا نہیں۔ خدا کی خودی اور کائنات کی خودی میں کوئی مشابہت نہیں کیوں کہ انائے قدر آفریں کے مزاج میں تغیّر و تبدّل کے کرشمے نظر آتے ہیں، لیکن خدا متغیر نہیں ہوتا[۳] اور انائے موثر کی خصوصیت تفریق و تقسیم ہے جس کے باعث بے شمار درجات انفرادیت ظہور پذیر ہوتے ہیں، لیکن خدا کی ذات اس سے ماورا[۴] ہے۔ نیز انائے موثر اور انائے قدر آفریں جو علی الترتیب زمانِ متواتر اور زمانِ خالص یا دوراں سے علاقہ رکھتی ہیں، دونوں کا مزاج سیمابی ہے اور ان میں اضطراب پایا جاتا ہے (کیوں کہ برگساں کے بقول زمانِ خالص بذاتِ خود ایک مسلسل جاریہ تغیّرات ہے) لیکن اللہ کبھی مضطرب اور بے چین نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ نہ زمانِ متواتر کہا جا سکتا ہے نہ زمانِ خالص بلکہ حقیقت یہ ہے کہ زمانہ خود اسی کے امر سے نمودار ہوا ہے[۵] کچھ اس طرح کہ اس میں ایک تخلیق پذیر

یا جوشِ قوتِ ارادی موجود تھی یعنی وہ قوتِ ناظمہ جو زمانِ خالص کو ایک مسلسل جاریہ تغیرات ہونے کے باوجود پراگندگی سے بچاتی رہی۔ وہ ایک انائے قدرآفریں تھی جو اپنے مرکز یعنی قلبِ زمانِ خالص سے بڑھ کر جب باہر پھیلنے لگی تو زمانِ متواتر کے ہم دوش انائے متوترہ کے بیشمار کرشمے نظر آنے لگے۔ کائنات انگیزی کی ابتدا ہو گئی اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق بے شمار افراد اس قوت کے قدرآفریں اور موثر انداز لیے ظہور پذیر ہونے لگے جنہیں یہ کائنات انگیز قوتِ ناظمہ "خودی" اپنے اپنے کارہائے منصبی کی تکمیل کے لیے اس طرح راہِ ارتقا پر لگائے رکھتی ہے کہ :-

دمادم رواں ہے یمِ زندگی — ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
ازل سے ہوئی ہے بدن کی نمود — نہ شعلے میں پوشیدہ ہے سوزِ دود
یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی — عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی
یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر — مگر ہے کہیں بے چگوں بے نظیر

اور اسی کے باعث :-

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

لیکن حقیقت یہی ہے کہ :-

خودی را از وجودِ حق وجودے — خودی را از نمودِ حق نمودے

جہاں تک آدمی کی حیثیت کا تعلق ہے جانداروں میں یہی وہ جان دار ہے جو انفرادیت کے بہت ہی اونچے درجے پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی حیثیت اور حقیقت کا کچھ نہ کچھ شعور بھی احساس بھی رکھتا ہے۔ مادی اور روحانی اعتبار

سے یہ ایک خود گیر مرکز ہے، لیکن ابھی تک مکمل فرد نہیں بن سکا۔ یہ کسی حد تک آزاد ہے اور کسی حد تک پابند۔ اسے مکمل آزادی تبھی حاصل ہو سکتی ہے جب یہ آزاد ترین فرد یعنی اللہ کا قرب حاصل کرے۔ اللہ اور آدمی میں جتنا فاصلہ ہوگا آدمی اتنا ہی نامکمل فرد ہوگا۔[1] لیکن اللہ کے قرب سے مراد اصل یہ ہوتا یا اللہ میں جذب ہو جانا نہیں ہے۔ کیوں کہ آدمی کا معاملہ تو یہ ہے کہ انائے محدود یعنی آدمی حشر کے روز بھی اپنی انفرادیت کے امتیاز کے ساتھ ہی انائے لامحدود یعنی اللہ کے سامنے اپنے اعمالِ گزشتہ کے نتائج کا مشاہدہ کرے گا۔[2]

الیغو

آدمی کی خودی یا شخصیت

ہر چیز ہے محوِ خود نمائی — ہر ذرّہ شہیدِ کبریائی
بے ذوقِ نمود زندگی موت — تعمیرِ خودی میں ہے خدائی
رائی زورِ خودی سے پربت — پربت ضعفِ خودی سے رائی
اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں — باقی ہے نمودِ سیمیائی[3]

فرد کی اعلیٰ ترین صورت جو اس وقت تک معلوم ہو سکی ہے الیغو ہے۔[4] جس کی فطرت یہ ہے کہ وہ دوسرے الیغو سے نزدیک ہونے

کے باوجود اپنی ذات ہی کو اپنا مرکز بنائے رہتا ہے اور اپنے لئے انفرادیت کا وہ ذاتی حصار قائم رکھتا ہے جس کے باعث دوسرے تمام الیغو اس سے دور رہتے ہیں۔ دراصل الیغو کی زندگی ایک قسم کی حالت کشیدگی کا نام ہے جو الیغو اور اس کے گرد و پیش کی معرکہ آرائی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کشیدگی سے امتیاز اور امتیاز سے انفرادیت کا تماشا دیکھتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو کسی بھی جان دار کی حقیقت اور حیثیت کے اندازے کا معیار وہ درجہ ہے جس کی امتیازی انانیت کا احساس اس جان دار کو ہو۔ افراد کے تصور کے بموجب صرف وہی حقیقتہً موجود ہے جو "میں ہوں" کا اظہار کر سکتا ہے لہٰذا اپنا وجود کسی کا مرتبہ اس احساس انانیت کے وجدانی احساس ہی کے باعث مقرر ہو سکتا ہے یہی انفرادیت کے اندازے کا معیار ہے۔

آخر میں انفرادیت گہری ہو کر شخصیت بن جاتی ہے۔ کیونکہ شخصیت آخر کیا ہے؟ ایک علیحدگی (امتیازیت) قوت ارادی اور کردار کی ایک مخصوص حالت کا نام ہی تو شخصیت ہے۔ جو آدمی نے حیات کے عام مدارج کے دوران حاصل کی ہے۔

حیات بذات خود آگے بڑھتی ہوئی اس حرکت کا نام ہے جو بہت کچھ جذب کر سکتی ہے اور اپنے سفر کے دوران راستے کی تمام رکاوٹوں کو پار کرتی جاتی ہے۔ یہ سفر کے مختلف مرحلوں پر مسلسل نت نئی آرزوئیں اور معیار پیدا کرتی رہتی ہے جن کی وجہ سے ایک مستقل کشیدگی کی سی کیفیت

ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ ایک تناؤ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ آدمی کے باب میں شخصیت اسی حالت کا نام ہے جو اُسی وقت تک برقرار رہتی ہے جب تک یہ کشیدگی یا تناؤ باقی رہے۔ اس حالت کے ختم ہوتے ہی آسودگی لاحق ہو جاتی ہے۔ اب چوں کہ شخصیت یا حالتِ کشیدگی آدمی کی سب سے گراں قدر یافت ہے لہٰذا اسے حالتِ آسودگی کی طرف نہیں جانا چاہیئے کیوں کہ حقیقت یہ ہے کہ تن میں کشیدگی برقرار رکھنے کا میلان پایا جاتا ہے بس وہی ہمیں باقی رکھنے پر مائل ہے[1]

قرآن مجید کے اشارات کے بموجب آدمی آزاد شخصیت کا امین ہے اور اس نے یہ امانت جملہ مصیبتوں کے اندازے اور احساس کے باوجود قبول کی ہے[2] چنانچہ آدمی کے لئے دائمی اجرۃ العمل کے بطور اس کی بے مثالیت، خودگیری کے بتدریج ارتقا اور فعالیت کی شدت پر مشتمل ہے۔

اقبال کے نقطۂ نظر کے بموجب فرد کو چاہیئے کہ وہ دنیا کی تمام مادی قوتوں اور ان کے مظاہرات نیز تمام کلچرل محاصلات اور روحانی فتوحات کو ساتھ لیتے ہوئے انا کا مکمل اثبات اور اُس کی بھرپور نشوونما کرے اور یہ حقیقت کبھی سامنے رکھے کہ انا جو ہمیشہ ترقی پانے کی طرف مائل رہتی ہے، ابھی تک ناآزمودہ قوتوں اور ماورائے قیاس امکانات کا ذخیرہ رکھتی ہے۔ چنانچہ اس کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ فرد اپنے آپ کو ہر قسم کے تعمیری اور مبارز مطالب تجربات کے لئے پیش کرے۔ اگر وہ جدوجہد سے گریز کریگا تو اس کی انفرادیت افسردہ و مضمحل ہو جائے گی اور اس کی قوتیں بروئے کار نہ آسکیں گی[3]

کیوں کہ انفرادیت کی نشوونما ایک ایسا تخلیقی فعل ہے جس میں آدمی کو عملی طور پر حصہ لینا چاہیئے۔ یعنی اُسے کسی مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہمیشہ فعال رہ کر اپنے گرد و پیش پر غالب آنا چاہیئے۔ یہ وہ صورت نہیں ہے جس کے رُو سے فرد انفعالی کردار کے ساتھ مجہول طور پر اپنے آپ کو جامد ماحول کے مطابق ڈھالتا چلا جاتا ہے [۱]

کرۂ ارض پر آدمی کا الیغو ایک متعین دوہرے منصوبے کا حامل ہے۔ ایک طرف تو یہ اپنے ماحول سے معرکہ آرا ہو کر اُسے مسخر کرتا ہے اور اس تسخیر کے ذریعہ آزادیاں حاصل کرتا ہوا آزاد ترین فرد یعنی اللہ کے قریب ہو جاتا ہے اور دوسری طرف اسے کشیدگی کی حالت بھی برقرار رکھنی ہوتی ہے جس کے باعث وہ حصولِ بقا کا اہل قرار پاتا ہے۔ حصولِ آزادی و بقا کے باعث الیغو ایک طرف تو تسخیرِ مکاں کرتا ہے اور دوسری طرف تسخیرِ زماں۔

الیغو کے اس دوہرے منصوبے کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ الیغو کو انسانیت کے سفرِ صعودی میں اس حد تک معاونت کرنا چاہیئے کہ بلند ترین انسان، فوق البشر یا مردِ کامل ظاہر ہو جائے۔ وہ حیات کی تمناؤں کا معیار ہے۔

اس اعتبار سے اقبال کے تصورِ خودی کو آدمی کے سفرِ ارتقاء پر مکمل تعین کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے [۲]

لیکن یہ ارتقاء کیسے ممکن ہے؟

جواب ہے "شخصیت کو مستحکم کرنے سے"۔ آدمی کو ایسی روش اختیار کرنا چاہیئے جو شخصیت کو مضبوط بنا سکتا ہے اور وہ سب کچھ نظر انداز کر دینا چاہیئے جس سے شخصیت کمزور ہوتی ہے۔ اقبال کے خیال کے بموجب شخصیت کا تصور

قدروں کا ایک معیار پیش کرتا ہے اور مسئلہ خیر و شر کو اس طرح حل کر دیتا ہے کہ بس وہ جو شخصیت کو مستحکم کرے خیر ہے اور باقی شر، لہٰذا یہ کہنا بے جا نہیں کہ شخصیت کا محلِ قرار ہی وہ کسوٹی ہے جس پر آرٹ، مذہب اور اخلاقیات کی جانچ ہونی چاہیئے۔ ؎

شخصیت کے دوست اور دشمن

اقبال کے بقول، حسبِ ذیل محرکات جو آدمی کو خود نگر، خود گر و خود گیر بناتے ہیں اس کی شخصیت کے دوست ہیں

(۱) عشق (۲) فقر (مادی اثبات سے بے نیازی اور خود کو ان سے برتر سمجھنا) (۳) صبر (۴) شجاعت (۵) کسبِ حلال (جائز کمائی) اور (۶) حقیقی اور تخلیقی فعالیت میں حصہ لینا ؎

نیز وہ محرکات جو شخصیت کی کمزوری کا سبب بنتے ہیں، اس کے دشمن ہیں اور مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) خوف (۲) سوال (۳) غلامی (۴) نسب پرستی ؎

شخصیت کو مضبوط بنانے والے محرکات سے تعاون اور اسے کمزور کرنے والے محرکات سے اجتناب کے باعث انسان قوی تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اس ارتقائی عمل کے دوران اُسے جو مرحلے طے کرنے چاہئیں، وہ حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) مرحلۂ اطاعتِ آئینِ الٰہی (۲) مرحلۂ ضبطِ نفس اور (۳) مرحلۂ نیابتِ الٰہی ؎

اور اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہیئے کہ خودی کا مکمل شعور اور اس سے بخوبی فیض یاب ہونا اُس وقت تک ممکن نہیں۔ جب تک زمان و مکاں کی حقیقت نہ سمجھ لی جائے کیوں کہ جہاں مشیٔ نظریہ ہو کہ لامحدود کو محدود کے اندر تولیا جائے وہاں زمان و مکاں کا سوال زندگی اور موت کا سوال ہے[۱] لہٰذا ہر فرد کو روحِ عصر کے اشارے سمجھ کر اور شخصیت کے دوست دشمن پہچانتے ہوئے اپنی خودی کو مستحکم کرنا چاہیئے تاکہ وہ حضور نبی کریمؐ کے قول :-

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ (جس نے اپنے نفس کو پہچانا اُس نے اپنے رب کو پہچان لیا[۲]) کے معیار پر پورا اُتر کر حقیقی قوت سے معاملہ آرائی کے لائق ہو سکے۔

اسرارِ خودی — مقدمات

پہلا باب

تمہید

نیست در خشک و تر بیشۂ من کوتاہی
چوب ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم

نظیری نیشاپوری کا یہ شعر سرنامۂ "اسرارِ خودی" ہے۔ نظیری کے بن میں کوتاہی کا نام و نشاں نہیں۔ اگر وہ کسی درخت کی لکڑی سے منبر نہیں بنا پاتا تو صلیب تراش لیتا ہے۔ یہ دو مصرعے آدمی کی ہمہ گیر صلاحیتوں کی تصویر ہیں اور اس اعتبار سے انہیں اسرارِ خودی کا پیش لفظ ہونا ہی چاہیئے تھا۔

اقبال کی نظم و نثر خودی کے زور پر آدمی کے با اختیار ہونے کا عہد نامہ ہے، اُن کی نظر میں جنّت سے نکالا ہوا انسان وہ راندۂ درگاہ نہیں جس کا نصیب کرۂ ارض پر مجہول اور منفعل زندگی گزارنا ہو، اسی لئے اُن کی چشمِ تصور روحِ ارضی کو آدم کا استقبال کرتے ہوئے یوں ترانہ بہ لب دیکھتی ہے :-

کھول آنکھ، زمین دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایامِ جدائی کے ستم دیکھ، جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ

یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آیا ہے مری باری تو محجوب ہوئیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

ہے تجھ سے زمانہ ترقی افکار کا طالب
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک ترے آہوں کے شرارے
قلبِ خودی کا اثر آہِ رسا دیکھ

خورشید جہاں تاب کی مانند ترے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں کنجشک مرے فرِ دوں نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

نالندہ ترے عود کا ہمنا ازل سے
تو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے
تو ہمدمِ دیرینہ اسرارِ ازل سے
محنت کشِ و خوار زیر و کم آزار ازل سے
ہے راکبِ تقدیرِ جہاں تیری رضا دیکھ

اقبال یہ نظم رکھ کر اس احساس سے عاری نہیں ہیں کہ یہ گنبدِ افلاک یہ کوہ، یہ صحرا یہ سمندر اور یہ ہوائیں، آدمی پر نور و رداس پیکر کے راستے میں ہمیشہ مزاحمت اور رکاوٹیں پیش کرتے رہیں گے۔ اس کے باوجود انہیں یقین ہے کہ خودی کی شان کی طرف سے آدمی کی راہ میں لائی ہوئی ہر

رکاوٹ اس کی قوتِ تسخیر کے لئے ضروری ہی نہیں مبارک ثابت ہوگی ۔ کیوں کہ یہی کبھی اس کی صلاحیتوں کے لئے صیقل بنے گی اور کبھی اس کی توانائیوں کے لئے مہمیز اور انہیں رکاوٹوں کے باعث "ممکناتِ قوت مردانِ کار" واقعات میں تبدیل ہو سکیں گے[۱] انہوں نے سوچا اور صحیح سوچا کہ آدمی کے ہاتھوں چراغ کی صورت گری کے لئے رات کا اندھیرا محرک بن کر رہے گا[۲]۔

آدمی کی اسی صلاحیت اور خالقیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے وہ آدم کی رضا کو راکبِ تقدیرِ جہاں کے خطاب کا مستحق سمجھتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس درد کا کیا کریں اور اس غم سے کس طرح نجات پائیں جس کے باعث غالب تڑپ کر کہہ اٹھے تھے کہ :-

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

اقبال بھی آدمی کی اس سبک سری اور بدحالی سے نگاہیں نہیں بچا سکے۔ انہوں نے اسے بڑی شدت سے محسوس کیا اور احساس کی تیز آنچ سے آتش بجاں ہو گئے۔ سوزِ دروں نے فغانِ نیم شبی کے سہارے بے چینی کا علاج کرنا چاہا۔ لیکن داغ سلگتے رہے، کرب بڑھتا گیا۔ آخر ایک رات پیر رومی کی زیارت نصیب ہوئی۔ پیرِ حق سرشت نے جو کہا مریدِ ہندی کے لئے بہشتِ گوش ہوا۔ اسرار سے پردہ ہٹا اور خودی کی حقیقت ظاہر ہو گئی۔ یہ باب انہی وارداتِ خیال کا عکاس ہے۔

اقبال نے اپنے فکر و شعور کی پرورش اور تربیت کے لئے مولانا جلال الدین رومیؒ سے جو فیض حاصل کیا ہے وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اپنے اسفارِ خیالی میں وہ پیرِ رومی کے ساتھ کئی نازک مرحلے طے کرتے نظر آتے ہیں۔ اور اداشناسِ مفاہیمِ قرآنی، مولانا روم سے اپنے سوالوں کے جواب پا کر مطمئن ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کا فلسفۂ سعی و عمل مولانا کے قول "کوششِ بے سودہ بہ از خفتگی" ہی کی صدائے بازگشت ہے۔ اس کے علاوہ مولانا کے جن تصورات نے اقبال کے فکر و نظر کی پرورش کی ہے وہ حسبِ ذیل موضوعات سے متعلق ہیں۔

۱۔ کامل یا معیاری انسان

۲۔ عشق

۳۔ حصولِ یقیں

۴۔ انائے محدود (آدمی) کا انائے لامحدود (اللہ) سے تعلق

اس باب کے آخر میں مثنوی کو اردو کے بجائے فارسی میں لکھنے کی مصلحت بتائی گئی ہے اور قاری سے یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ اسے کلام کی ظاہری خوبیوں پر نظر کرنے کے بجائے مفاہیم کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔

دوسرا باب

اصل نظامِ عالم خودی سے ہے اور تسلسلِ حیاتِ تعیناتِ وجود کا انحصار انحکامِ خودی پر ہے

اقبال کے تصور کے مطابق جب خودی ایک باہوش تخلیقی قوتِ ارادی ہے اور کارفرمائی کے اعتبار سے اس کے دو انداز ہیں۔ ایک تو آفرینِ دوسرا مؤثر، انائے قدر آفریں کا مزاج تغیر و تبدل سے عبارت ہے اور انائے مؤثر کا تقسیم و تفریق سے۔ ہمارے اردگرد جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ انائے مؤثر کی کارگری ہے لیکن حقائق کی گہری سطح اور خود کارے شعور کی اندرونی پرتوں میں انائے قدر آفریں کا رفرما ہے۔

کائنات میں ہر وجود ایک معین فرد ہے اور ان بے شمار افراد میں ایک ربط، ایک تسلسلِ حیات ہے جس کے باعث وہ پراگندگی کا شکار نہیں ہوتے۔ نظامِ عالم دراصل تسلسلِ حیاتِ تعیناتِ وجودی کا دوسرا نام ہے جس کا انحصار اس قوتِ ناظمہ پر ہے جسے اقبال "خودی" کہتے ہیں۔ یہ کام جو اور کارگر قوت، تخلیق کی جولانیوں کو برقرار رکھنے کے لیے عجیب عجیب ڈھنگ اور بہت نئے روپ لے کر سامنے آتی ہے۔ یہ چوکر مثبت اور منفی کرداروں سے بہ یک وقت مزین اور مسلح ہوتی ہے۔ اس لیے اپنے مقاصد کی پیش رفت

کے لئے کبھی آغوشِ تدبیر کے رنگ دکھاتی ہے اور کبھی تقدیم و تخلیق کے نظارے۔ نیز اسی کے بحث زندگی کا مذاق یہ نظر آتا ہے کہ :-

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں — کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں
نہ دیتا ہے انجمن آفرینی — مگر عین محفل میں خلوت نشیں

نیز :

اثر کر جہانِ مکافات میں — رہی زندگی موت کی گھات میں
مذاقِ دوئی سے نہ ہو تشنہ تخم — اگتی دشت و کہسار سے نوع نوع
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی ہیں — اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات — اکبر ناپائے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

نقشِ حیات کا مٹ مٹ کے اکبر ناپائے اس وجہ سے ہے کہ خودی زمانے کے دریا میں بہنے کے باوجود زمانے کے الٹ پھیر یعنی زمانِ متوازن کی پابند نہیں ہے ماس کی کیفیت تو یہ ہے کہ :-

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

اور :-

ازل سے ہے یہ کشمکش میرے ساتھ — موی خاکِ آدم میں صورت پذیر

خاکِ آدم میں صورت پذیر ہونے کی منزل تک تعینات وجود حسب تقاضائے تغیرات سے گزرتے ہیں اس کو دیکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر خودی تطور پذیر ہوئے کے باوجود خلوت پسند نہ ہوتی۔ اگر وہ من و تو سے پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ من و تو سے پاک نہ ہوتی تو افرادِ کائنات میں وہ ربط،

وہ تسلسلِ حیاتِ تعینات وجود جو نظر آتا ہے منقوش ہوتا یا دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ سمے سے وہ سمے ہو تو جسے تمام عالم کہا جاتا ہے۔ ہزاروں طرح کی انجمن آفرینیوں میں لگے رہ کر عین محفل میں خود کی خلوت گزیں رہنا ہی اس کی وہ ادا ہے جس سے وہ اپنے آپ کو زندگی میں منقلب کرنے کے بعد بھی از خود رفتہ نہیں ہوتی بلکہ اس طرح خود کو مستحکم کرتی ہے اور اس حالتِ استحکام کو جا پہنچتی ہے جس پر تسلسلِ حیاتِ تعینات وجود منحصر ہے۔

تیسرا باب

حیاتِ خودی تخلیق و تولیدِ مقاصد سے ہے

اگر زرمزِ حیات آگہی بجوئے و مگیر
دلے کہ از خستِ خارِ آرزو پاک است

حیات آگے بڑھتی ہوئی اس حرکت کا نام ہے جو بہت کچھ ویران کر سکتی ہے اور اپنے سفر کے دوران مسلسل آرزوئیں اور معیار پیدا کرتی رہتی ہے۔ لہٰذا فرد کی نشوونما کے لئے بھی یہی ضروری ہے کہ نت نئے مقاصد اور منصوبے تشکیل پاتے رہیں۔ کیوں کہ اس سے ہماری فعالیت کی سمت مقرر ہوتی ہے اور نشوونما

آنا کو رنگ ملتا ہے[۱]

اقبال کے تصور کے مطابق خودی کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ گوناگوں تجربات سے اپنے آپ کو مستحکم کرتے۔ اپنے تخیل اور تحمل کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ مسلسل سفر کو کسی مقام پر ختم نہیں کرتی۔ نئی نئی منزلوں تک پہنچنے کا شوق اسے بے چین کیے رہتا ہے۔ وہ لوح و سنگ پا سے کبھی ختم نہیں ہوتا اور کوئی مقام اس کے لیے انتہائے راہ کم نہیں رکھتا۔ خودی کو یہ احساس ہے کہ:۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
تہی اس سے یہ خودی کی منزل نہیں ہے

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود[۲]

ان میں سے ہر جہان آدمی کی تخیل اور اس کی تخلیقی فکر و کردار کے اظہار کا منتظر ہے۔ لہٰذا اس زمین ستارے اور سیارے میں آفتاب کی تلاش آدمی کا مقصد نہ ہونا چاہیے۔

مقصد تو دور سے نظر آنے والی روشنی ہے جس کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔ یہ منزل ہمارے آگے ہے۔ اسباب و علل کی دنیا کی طرح ہمارے پیچھے نہیں ہے۔ ماضی کے جبر کی نگاہ سے ہم مستقبل کی آزادیوں کو دل کش منظر دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں کی مادی اہمیت ماضی کے بے معنی تھی۔ واحساس کی دنیا میں مستقبل زیادہ اہم ہے۔ آدمی اپنے مقاصد کے ذریعے سے حقائق کی تخلیق کرتا ہے۔ قسمت کو واقعات میں تبدیل کرتا ہے اور ضمیر وجود سے نئے جہان برآمد

کر لیتا ہے۔ آدمی کی خودی سعیِ مقاصد میں حقائق کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کرتی بلکہ اُن کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے اُن میں حسبِ منشاء تغیر چاہتی ہے [1]

اقبال کے نزدیک بموجب، مقاصد کی تخلیقی استعداد روحانی حیثیت رکھتی ہے اور یہ استعداد بغیر تہذیبِ نفس کے پیدا نہیں ہو سکتی جو مذہب و اخلاق کی بنیاد ہے [2] مذہبی زندگی جتنی اعلیٰ ہوگی اس قدر مقاصد واضح اور معین ہوں گے [3]۔

اقبال نے آدمی کی اخلاقی اور مادی زندگی کے تضاد کو بڑی حد تک رفع کرنے کی کوشش کی ہے اور اسلامی روایات کے اس اہم اصول کو واضح کر دیا ہے کہ آدمی کی زندگی میں روحانی اور مادی عناصر کی ہم آہنگی ہونا چاہیئے جس کے بغیر آدمی کی فطرت درجۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ جان و تن کے خصائص میں فرق ہے کیونکہ :-

چیست جان؟ جذب و سرور و سوز و درد
نزول تسخیرِ سپہرِ گرد گرد

چیست تن؟ با رنگ و بو خو کردن است
با مقامِ چار سو خو کردن است [4]

لیکن تن یا مادہ جو رنگ و بو کا طلب گار اور اطراف و اکناف کا اسیر ہے، جان کے اس جذب و سرور اور سوز و درد کو نقصان نہیں پہنچاتا جو تسخیرِ ارض و سما کے لئے درکار ہے۔ تن کے تقاضے روحانی مطالبات کا راستہ نہیں روک سکتے۔

ایں بدن با جانِ ما انباز نیست
مشتِ خاکے مانعِ پرواز نیست [5]

یہ تو آدمی پر منحصر ہے کہ تن کا ہو رہے یا جاں پرور کے لئے تن سے کام لے۔ اگر اس نے اپنا اور اپنے علوم و فنون کا مقصد یہ قرار دے لیا کہ وہ چار سو میں گھر کر رنگ و بو ہی سے سروکار رکھے گا اور حواس سے لذت اندوز ہونے کے علاوہ کچھ نہ کرے گا تو اس کا نصیب زوال ہے۔ وہ زوال پذیر ہو کر اس سطح پر آ گرے گا جہاں اس کے مقدر میں ٹھوکریں ہی ٹھوکریں ہوں گی۔

تن کا ہو رہنے سے آدمی مجبور اور محصور ہو جاتا ہے لیکن جاں کی بالیدگی اسے آزادیاں بخشتی ہوئی مقامات عالیہ تک پہنچا دیتی ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہئے کہ جسم کے سرکش تقاضوں کو روحانی مطالبات سے ہم آہنگ رکھتے ہوئے مقاصد آفرینی کی طرف مائل ہو۔ اگر ایسا ہو سکا تو ان ہی مقاصد کے دامن میں حیات کی اعلیٰ قدریں نظر آئیں گی، انہیں میں تخلیقی استعداد بڑھے گی اور یہی روشن اور واضح بھی ہوں گے۔

اقبال کے بقول ان بلند، روشن اور دل پذیر مقاصد کا حصول آرزو کے بغیر ممکن نہیں۔ آرزو ہی وہ سرمایۂ حیات ہے جس کے نہ ہونے سے زندگی موت بن جاتی ہے۔

زندہ از نفی تست مردہ گور شعلہ از نقش تست خرمن سوز

چوتھا باب

خودی عشق و محبت سے مستحکم ہوتی ہے

مقاصد کی لگن کے لئے اقبال نے "عشق" کی اصطلاح استعمال کی ہے جس کا ولولہ انسان کی فطرت میں اُبلا پڑتا ہے اور جس کے بغیر اس کا معنوی ارتقاء ادھورا رہتا ہے[۱]۔ اقبال اور مولانا روم عشق کو زندگی کی بڑی ہی عظیم قوت سمجھتے ہیں کہ جس کی حقیقت کے اظہار سے زبان معذور ہے پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ عشق کسی بار کو گراں نہیں سمجھتا اور کسی تکلیف کو نظر میں نہیں لاتا۔ یہ اپنی سکت سے زیادہ کے حصول کی کوشش کر بیٹھتا ہے اور سرکشی کا نام ہے۔ ممکن کہ کر گزرنے کے لئے حیلوں کی آڑ نہیں پکڑتا کیونکہ یہ اپنے لئے سب کچھ روا اور ہر کام ممکن جانتا ہے۔ یہ سب کچھ کر گزرنے کا اہل ہے لہٰذا ان مرحلوں کو بھی طے کر کے کسی نہ کسی نتیجے تک پہنچ جاتا ہے جہاں عشق و محبت سے عاری وجود چکرا کر گر پڑتے ہیں[۲]۔ یہ سب صحیح ہے لیکن اقبال اس اصطلاح کو اور زیادہ وسیع معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ :-

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو — عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا — اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفےٰ — عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام

عشق فقیہہ حرم ۔ عشق امیر جنود عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات[۵۱]

اقبال کی نظر میں عشق اور خواہشِ جذب و تسخیر ہم معنی ہیں اور اس کی بلند ترین شکل قدروں اور معیاروں کی تخلیق نیز اُن کے حصول کی کوشش ہے[۵۲]۔ اس اعتبار سے عشق کی ادائیں بھی انوکھی ہوتی ہیں مثلاً :-

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق کبھی شاہِ شہاں نوشیرواں عشق
کبھی صحرا میں آتا ہے زہ پوش کبھی عریاں و بے تیغ و سناں عشق

اور :-

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق کبھی سوز و سرور انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر کبھی مولا علی خیبر شکن عشق[۵۳]

اقبال اور رومی دونوں کے تصور کے بموجب عشق کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ عاشق کے دل میں معشوق کی صفات جذب کر لینے کی شدید خواہش ہو[۵۴]۔ اس سے خودی مستحکم ہوتی ہے اور فرد کی صلاحیتوں میں ارتکاز اور اُن کی شدت میں امکان پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ اسی وجہ سے ہمیں بڑی بڑی شخصیتوں کے تذکرے میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں جنہوں نے اپنی خودی کو منشائے الٰہی کے مطابق بنا لیا تھا یہی سبب ہے کہ اولوالعزم پیغمبروں اور شہیدوں نے اطاعتِ الٰہی کی راہ میں عام آدمی کی سطح سے بلند ہو کر حیرت انگیز معجزے دکھائے ہیں[۵۵] مثلاً :-

عشق بازان چہ عجب خیبر کشا و عشق ۔ اندام مہ چاک کے تہا و[۵۶]

اقبال کے بقول منشائے الٰہی کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے ضروری ہے کہ پیغمبرِ اسلام کی ہدایت "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ" (اپنے میں اللہ کے اخلاق "صفتیں" پیدا کرو) پر عمل کیا جائے۔ یہ کام آسان نہیں۔ اگر ہے تو بس اس طرح کہ کسی ایسی ذات سے عشق ہو جائے جس کے افکار و اعمال منشائے الٰہی سے ہم آہنگ ہوں، ایسی ذات پیغمبرِ اسلام کی ہے لہٰذا اقبال اُن سے والہانہ عشق کا مشورہ دیتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ اُن کا اسوۂ حسنہ کو پوری طرح اپنائے بغیر اُن کی ذات سے عشق ممکن نہیں۔ اُن کے بقول عشق اتباعِ سُنّتِ نبوی ہی کا ایک نام ہے اور اسی کو تقلید کہتے ہیں۔

اس باب میں تقلید کے معیار کو ظاہر کرنے کے لیے حضرت بایزید بسطامی رح کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ بسطامی رح نے خربوزہ کھانے سے صرف اس لیے اجتناب کیا تھا کہ وہ اس پھل کو حضور نبی کریم ص کے طریقہ سے نہیں کھا سکتے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ آپ نے یہ پھل کس طرح نوش کیا تھا۔

اتباعِ سُنّتِ نبوی کے علاوہ، اقبال کسی کی پیروی پسند نہیں کرتے بلکہ اس کے علاوہ ہر تقلید کو شخصیت کے لیے مضر سمجھتے ہوئے ہدایت کرتے ہیں کہ :-

> تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
> کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ[۳]

پانچواں باب

خودی سوال سے نسبتاً موقی ہے

سوال یا گدائی اُن برائیوں میں سے ایک ہے جو خودی کو کمزور کرتی ہیں۔ خودی کا اقتضا تو یہ ہے کہ فرد اپنی صلاحیتوں کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ انہیں جہد و زہد کے ذریعہ بروئے کار بھی لائے۔ لیکن سوال کا عادی ہو کر آدمی خود پر اعتماد نہیں کر پاتا۔ دوسروں کا دست نگر ہو کر عمل کی دنیا سے اتنا دور ہو جاتا ہے کہ اس کی صلاحیتیں اس کی نظر سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔

سوال کا دفاع چاہنے کے لئے قرآن مجید سے واضح اشارے ملتے ہیں۔ چنانچہ ان صاحب مندوں کا ذکر کرتے ہوئے جو ڈھٹائی سے دست سوال دراز نہیں کرتے، ارشاد ہوتا ہے کہ :-

"تو اُن کے چہرے سے پہچانتا ہے وہ لوگ لپٹ کر نہیں مانگتے۔"[۱]

قرآن مجید میں اور دیگر بھی متعدد سوال کا استعمال فکر انگیز ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے سامنے یہ معاملہ تھا کہ مدعی کے بقول اس کے پاس صرف ایک دنبی تھی جسے فریق مخالف اپنی تندہیاری کے زور پر حاصل کرنا چاہتا تھا حالانکہ اس کے پاس نو سے دنبیاں تھیں لہذا :-

62701

(حضرت داؤدؑ نے) کہا "اس نے اپنی دُنبیوں کی طرف تیری دُنبی مانگ کر ظلم کیا" [۱]

ان ارشادات کی روشنی میں سوال وہ طلب ہے :-

۱۔ جو آدمی سے غیرت چھین لے۔

۲۔ جس کے باعث آدمی ناروا طریقوں سے فائدہ اٹھانا چاہے، اور

۳۔ جو آدمی کی تخلیق پر ورثہ لوگوں کے ضعف و زوال کا باعث ہو

مختصراً یوں کہا جائے کہ وہ پیر معاشرہ محنت کے بغیر جو کچھ بھی حاصل کیا جاتا ہے وہ بھیک ہے [۲]

لہٰذا اقبال کی نظر میں رعایا سے خراج وصول کر کے عیش کرنے والا بادشاہ زرتار کپڑوں میں لپٹا ہوا بھیک منگا ہے۔ اُن کے بقول :-

میکدے میں ایک دن اک رندِ زیرک نے کہا — ہے ہمارے شہر کا والی گدائے بے حیا
"تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اُسے — کس کی عریانی نے بخشی ہے اُسے زرّیں قبا
اس کے آبِ لالہ گوں کی خونِ دہقاں سے کشید — تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا
اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی — دینے والا کون ہے مردِ غریب و بے نوا
مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج — کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا [۳]

سوال کی لعنت سے بچانے والی صفت خودداری ہے جس کے معیار کے بطور حضرت عمر فاروقؓ کے کردار کو پیش کیا گیا ہے اور اس واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک سفر کے دوران آپ کا تازیانہ ہاتھ سے گر گیا تھا جسے اٹھانے کے لئے آپ بہ نفسِ نفیس اونٹ سے نیچے اترے اور اتنے سے کام کے لئے بھی کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کیا۔

چھٹا باب

جب خودی عشق و محبت سے محکم ہو جاتی ہے تو نظامِ عالم کی تمام ظاہر و پنہاں قوتوں کو مسخر کر لیتی ہے

چوتھے باب اور اس باب کا موضوع ایک ہی ہے۔ ان اوراق میں مزید تشریح و توضیح کے لئے حضرت شاہ بو علی قلندرؒ کے جلال کا واقعہ قلم بند کیا گیا ہے۔

حضرت قلندر صاحب کا نام شیخ شرف الدین ہے۔ سال ولادت ۶۰۵ھ اور سنہ وفات ۷۲۴ھ ہے۔ مزار مبارک پانی پت میں ہے۔ آپ کی زندگی میں دہلی۔ فرمانِ غلاماں خلجیوں اور تغلقوں کا دارالسلطنت رہا۔ آپ ان تمام علوم و فنون سے اچھی طرح واقف تھے جو اس وقت ایک فاضل کے لئے ضروری سمجھے جاتے تھے۔

چالیس برس کی عمر میں پانی پت سے دہلی تشریف لانے کے بعد آپ نے مسجد قوت الاسلام کو درس و تدریس کا مرکز بنایا اور پھر چالیس سال تک یہی آپ کا معمول رہا۔ اس کے بعد یہ خدمت مولانا جمیع درویشاں و دانش مندان کو عنایت ہوئی۔ یہ تحفہ کا منصب فقط آپ کے سپرد کر دیا۔ وہ بیس سال

یہ مسندِ افتار آپ کے نفوسِ قدسیہ سے آراستہ رہی ابھی یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ قلندر صاحب پر جذبۂ شوق کا غلبہ ہوا اور آپ دہلی سے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک رات دریائے جمنا کے کنارے قیام کیا اور جتنی کتابیں تھیں دریا میں ڈال دیں۔ پانی پت پہنچے تو ڈیڑھ ہزار آدمی ساتھ تھے۔ سب کو رخصت کر کے اسی علاقے میں ٹھہر گئے۔ اب نہ پیری تھی نہ مریدی جو کچھ تھا زہد و عبادت اور قلندری گویا یہ عالم تھا کہ:-

عشق اوّل، عشق آخر، عشق کُل
عشق شاخ و عشق نخل و عشق گُل

اور شانِ قلندری کی یہ کیفیت کہ "پانچ چھ بادشاہ اور تاجدار اس فقیر کی چوکھٹ پر حاضر ہو کر آستانہ بوسی کرتے تھے۔"

بموجب ارشادِ حضور سرورِ کائنات، حضرت قلندر صاحبؒ ترک و استغنا کے مقامِ بلند پر پہنچ گئے تھے چنانچہ اپنے اشعار میں حدیثِ نبیٔ کریم "خیر الغنا غنا القلب" کی تفسیر پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

زہد و تقویٰ چیست اے مردِ فقیر — لا طمع بودن ز سلطان و امیر
گر بدست آید ترا گنجِ نقود — ورنہ داری ہمتِ عالی چہ سود

حضرت قلندر صاحب کے بقول "مجھے فیضِ روحانی حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پہنچا ہے جس طرح سورج کی کرنیں دیوار پر پڑتی ہیں تو دیوار منور ہو جاتی ہے۔"

آپ کی منظوم تصانیف میں ایک دیوان۔ مثنوی بوعلی قلندر، شاہ قلندر۔ غزلیات و مثنویات کا ایک مجموعہ اور نثر میں حکم نامہ اور ایک مکتوب مشہور ہیں۔

اس باب میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ غالباً علاؤالدین خلجی کے زمانے

کا ہے۔ اس بادشاہ کا دورِ حکومت ۶۹۵ھ/۱۲۹۰ء سے ۷۱۵ھ/۱۳۱۵ء تک رہا ہے اور بحالتِ قلندری حضرت بوعلی شاہ کی دہلی سے پانی پت کو واپسی ۷۰۴ھ کے آس پاس معلوم ہوتی ہے۔ پھر ایک واقعہ یہ بھی سامنے آتا ہے کہ علاؤ الدین خلجی نے حضرت امیر خسروؒ کو قلندر صاحب کی خدمت میں کچھ ہدیے دیکر نذر بھیجی تھا اور جب انہوں نے قلندر صاحب سے درخواست کی کہ بادشاہ کو کچھ تحریر فرمادیں تو انہوں نے کاغذ کے پرزے پر لکھ کر دے دیا تھا کہ :-

"علاؤ الدین خلجی خطۂ دہلی مقرر دارند کہ بہ بندگانِ خدا زندگانی نیکو کند"[1]

(علاؤ الدین خلجی کو خطۂ دہلی مقرر رکھتے ہیں تاکہ بندگانِ خدا کے ساتھ اچھی زندگی بسر کرے۔

اس باب کے اشعار سے جہاں عشق و محبت کے بے پناہ جلالی اثرات کا پتا ملتا ہے وہیں ترک و استغنا کے اسلامی تصور اور رہبانیت پسندوں کے تصورِ ترکِ دنیا کا فرق بھی سامنے آجاتا ہے۔

ساتواں باب

حکایت

اس حکایت میں ہے کہ مسئلہ نفیِ خودی متعلقہ ہے قوموں کی اجتماعی
جو اس مخفی طریقے سے اُن قوموں کے اخلاق کو کمزور بنا دیتی ہیں

سخت باریک ہیں امراضِ اُمم کے اسباب
کھول کر کہیے تو کرتا ہے بیاں کوتاہی
دینِ شبیری میں غلاموں کے امام اور شیدا
دیکھتے ہیں فقط اک فلسفۂ رو باہی[1]

اس حکایت کے دل چسپ پیرائے میں اقبالؔ نے نفیِ خودی یعنی رہبانیت یا ترکِ دنیا کے مسئلے کو واضح کیا ہے۔ ایک دو نہیں عرصۂ تاریخ میں ایسے کئی مقام ملتے ہیں جہاں آدمی نے یہ سوچنا پسند کیا ہے کہ :-

بقدرِ ہر سکوں راحت بود بیت گانگی راحت را
دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مردن

(مرزا صائب)

[illegible] کہ سکون کے لیے [illegible] ہے۔ دوڑنے سے زیادہ چلتے ہیں۔ چلنے سے زیادہ کھڑے رہتے ہیں۔ اس سے زیادہ بیٹھتے ہیں بیٹھنے سے زیادہ سوتے ہیں اور [illegible] زیادہ مر جانے میں)

اقبال کی باریک بین نظر سے دیکھا جائے تو اس افتادِ طبع کا سانچا مغلوب قوموں کا مخصوص ذہن ہے۔

دوسری صدی قبل مسیح میں جب یونانی [illegible] رومۃ الکبریٰ سے مغلوب ہوئے تو زندہ دلانِ یونان کی زندہ دلی، غیر قوم کا محکوم بن جانے کے بعد مُردہ دلی میں تبدیل ہو گئی اور اس ساری مُردہ دلی کا فلسفہ زبان پر یہ ہو کہ بڑے بیڈرسل کے بقول "ارسطو کے بعد کا فلسفہ دنیا سے منتظر آسرا سے لگا۔"

یہودیوں پر یہ مصیبت اس طرح آئی کہ فتوحات کی رو میں جب روم والوں نے ان کی بے حد آبادیوں کو غلام بنانے کے لیے پے در پے حملے کیے اور نوبت بایں جا رسید کہ [illegible] کے ایام شباب [illegible] کے آس پاس [illegible] روم والوں کے غلام بن کر رہ گئے تو یکبارگی روم کی بڑی بڑی بندرگاہوں میں ایک خاص عقیدے کی وبا پھیل پڑنے لگی اور مغلوب یہودیوں نے وہ دستور پورا پورا اپنا لیا جو ان کے حوصلہ مند آقاؤں کی طرزِ زندگی سے بالکل مختلف تھا۔ انہوں نے اپنی غلامی، کمزوری، بدنصیبی اور غربت کو مظہرِ خیر سمجھنا شروع کر دیا۔ [illegible] ان میں نظر آنے لگی کہ خودی کی نفی کر دی جائے۔ یہ ایک خوش تدبیری تھی جسے یہودی اپنے اجتماعی وجود کی بقا کے لیے اپنانے پر مجبور ہو گئے۔

آئینۂ تاریخ میں کئی غلام قومیں اس تدبیر کا سہارا لیتے نظر آتی ہیں لیکن یہ دفاعی تدبیر ہی نہیں ہے، اقبالؔ کے بقول اس کا ایک جارحانہ رُخ بھی ہے یعنی وہ مخفی اثر جس کے ذریعے مغلوب قومیں حکمراں قوموں کے اخلاق کو کمزور بنا کر اُن پر بالادستی حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

مسلمانوں کی تاریخ میں یہ فتنہ اس طرح اُبھرا کہ پہلی ہی صدی ہجری میں جب دمشق مرکزِ حکومت بنا تو مسلمانوں میں عربی اور عجمی کے امتیازات بڑی شدت سے نمودار ہونے لگے۔ ابن حزم الاندلسی کے بقول "اہلِ فارس" وسعتِ سلطنت اور تمام اقوامِ عالم پر بالادست ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو بہت ہی بزرگ و برتر سمجھتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے اپنے لئے احرار اور بقیہ لوگوں کے لئے غلام کا لقب وضع کر لیا تھا۔[۱] لیکن جب وہ ریگستانِ عرب کے شتربانوں سے مغلوب ہوئے تو اوّل اوّل انہیں اپنی ذلت کا شدید احساس ہوا مگر اسلام کے اصولِ مساوات و انصاف اور صحابہ و تابعین اور علماء و فقہا کے دین دار طرزِ عمل نے نہ صرف یہ کہ ان کے اس زخم پر مرہم رکھ دیا بلکہ انہیں عالم گیر اُمتِ مسلمہ کے اندر ان سب شرفا سادات کے ساتھ دینے کرنا شروع کر دیا۔ اب اگر اس کی پشت پر حکومت کی انتظامی پالیسی بھی انہیں اصولوں کے مطابق ہوتی تو کبھی کسی غیر عرب قوم کے اندر اپنی علیحدگی اور قوم پرستی کا جذبہ پیدا نہ ہوتا۔[۲]

لیکن ہوا یہ کہ عرب مسلمانوں کے ساتھ غیر عرب نو مسلموں کے مساوی حقوق کا تصور قریب قریب مفقود ہو گیا پھر یہ خرابی اور آگے بڑھی، والی۔ قاضی حتیٰ کہ امامِ نماز مقرر کرتے وقت بھی یہ دیکھا جانے لگا کہ آدمی عرب ہے یا غیر عرب۔ اس لئے

عجمیوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اسلامی فتوحات نے دراصل انہیں عربوں کا غلام بنا دیا ہے اور اب وہ اسلام قبول کر کے بھی عربوں کے برابر نہیں ہو سکتے۔[۱]

بنی امیہ کا دورِ حکومت سو سال بھی نہ چل پایا تھا کہ ختم ہو گیا اور زمامِ اقتدار بنی عباس کے ہاتھ آئی۔ لیکن وہ نسلی، قبائلی اور وطنی عصبیتیں جو بنی امیہ سے بھڑکائی گئیں بنی عباس کے عہد میں پہلے سے بھی شدید تر ہو گئیں۔ اور بنی امیہ کے دور میں اُن کے عربی تعصب کی وجہ سے جو قوم پرستی (شعوبیت) کی جو آگ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی بنی عباس کے زمانے میں وہ پوری قوت کے ساتھ بھڑک اٹھی۔[۲] ابن حزم کے بقول "انہوں نے بصورتِ جنگ مختلف اوقات میں اسلام کو فریب دینا چاہا"[۳] اور یہی نہیں کہ صرف عربی عصبیت کے خلاف محاذ لگایا بلکہ خود اسلام کے خلاف بھی "زندقہ" کا ایک محاذ اٹھا کھڑا کیا۔[۴] یہ فرقہ جسم کو ذلیل اور مادی چیزوں کو حقیر سمجھنے کی تعلیم دیتا تھا اور منصور عباسی کے عہد (۱۳۶ھ - ۷۵۴ء) میں پوری طرح سر اٹھا چکا تھا۔ اس کے اخلاقی دستور کی نمایاں خصوصیت دنیا میں زہد اور آخرت کے لئے عمل کی تعلیم تھی۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ گوشت نہ کھانا، پانی تو بالکل نہیں لگانا چاہیئے اور کسی قسم کے جانور کو ہلاک نہیں کرنا چاہیئے۔[۵]

اس طرح سیاسی تعلیم کے مقابل رہبانیت کے نام پر ایک وقائی تدبیر اپنے کے ساتھ ساتھ مغلوب عجمیوں نے اس تعلیم و تلقین کے ذریعہ مسلمانوں کو صرف اعتقادی اور اخلاقی نقصان کے خطرے ہی سے دوچار نہیں کیا بلکہ سیاسی و اجتماعی حیثیت سے بھی قوم مسلمان کی ملت اور ریاست کو چور چور کر دینے والا تھا۔ مغلوب قوموں کی یہ اعتقادی اور اخلاقی تباہی کا موضوع ہے۔

آٹھواں باب

افلاطونِ یونانی جس کے تصورات سے تصوف اور ادبیات اسلامیہ بہت متاثر ہوئے مسلکِ گوسفندی پر عامل تھا اس کے تخیلات سے دُور رہنا واجب ہے

کائنات کی حقیقت کے بارے میں تین نظریئے سامنے آتے ہیں (۱) یہ کہ کائنات اپنے وجود کے لئے کسی کی محتاج نہیں اور اشیائے کائنات کا وجود حقیقی اور بذات خود قائم ہے۔ اس نظریئے کو ماننے والے مادّیین یا مادّہ پرست کہے جاتے ہیں۔

۲۔ یہ کہ کائنات کا وجود حقیقی نہیں ہے بلکہ اشیائے کائنات کسی نہ کسی حقیقی نمونے کی نقل ہیں۔ حقیقی اشیا کی ہر نوع کا ایک نمونہ (عین) ہے جو عالمِ مثال میں موجود ہے اور خارجی طور پر کائنات میں جو کچھ بھی نظر آتا ہے فریبِ نظر ہے۔ یہ نظریہ عینیین یا تصور پرستوں کا ہے [۱]

۳۔ اور یہ کہ کائنات کا وجود تو حقیقی نہیں ظلّی ہی ہے یعنی وجودِ کائنات کسی حقیقی وجود کا ظلّ (سایہ) ہے لیکن یہ سایہ فریبِ نظر نہیں ہے بلکہ خارجی طور پر موجود ہے۔ اسے معروضی تصوریت کہا جاتا ہے۔

افلاطون تصور پرستوں (عینیین) کا سردار اور اقبال معروضی تصوریت کے نمائندے ہیں۔

سقراط کا شاگرد افلاطون (تقریباً ۴۲۷ ق م تا ۳۴۷ ق م) ایتھنز میں پیدا ہوا تھا۔ اس کے خیال کے بموجب مادہ "کچھ نہیں" ہے۔ خارجی دنیا ادراک کے اعتبار سے نفس کی اور ساخت و کارکردگی کے اعتبار سے اعیان کی ذیلی ہے۔ لہٰذا کائنات کو اس نمونۂ کامل کی نقل بدرجۂ اوسط سمجھنا چاہیے جو کسی مائل بہ تخلیق روح کے تصور میں ہے۔[1] "اعیان" ان اشیاء عظیم تر حقیقتیں ہیں جن کا علم دراک کے ذریعہ ہوتا ہے۔[2] مثلاً عینِ انسان کسی بھی انسان سے زیادہ حقیقت ہے۔

افلاطون کے بقول "اعیان" آفاقی جوہر ہیں یعنی وہ مطلق اور بنیادی حقیقتیں ہیں جن پر سب کی اشیاء کا دارومدار ہے۔ لیکن وہ خود کسی پر منحصر نہیں۔ اپنی نوع کے اعتبار سے ہر عین مستقل اور مطلقاً مکمل واحدہ ہے اور اس کا کمال ہی اس کی حقیقت ہے۔

"اعیان" سدا ثابت اور آفاقی ہوتے ہیں۔ لیکن مشاہدے میں نہیں آسکتے اس لئے یہ مسئلہ "عالمِ اعیان" نامشہود کہا جاتا ہے۔ افلاطون کے بقول چونکہ حواس کی دنیا "مشاہد" ہے اور "عین" ادراک تعقل کا معروض ہے۔ اس لئے "عین" اور محسوس کی جانے والی شے کی صفات کچھ متضاد اور کچھ مختلف ہوتی ہیں۔ مثلاً:-

عین: ثابت اور محسوس کی جانے والی شے: غیر حقیقی

عین کی مندرجہ ذیل صفات محسوس کی جانے والی شے: مخصوص اور انفرادی

عین واحد ہے اور محسوس کی جانے والی شے بہ کثرت

عین ماورائے زمان و مکاں ہے اور محسوس کی جانے والی شے زمانی اور مکانی

عین دائمی اور ناقابلِ تغیر ہے اور محسوس کی جانے والی شے قابلِ تغیر۔

مزید برآں یہ کہ حواس کی دنیا چونکہ ہر لمحہ متغیر ہوتی رہتی ہے، اس لئے اس کا علم ممکن نہیں۔ لہٰذا اس دنیا میں ہم جسے علم کہتے ہیں وہ صرف فریبِ نظر ہے۔ علم اگر ممکن ہے تو ناقابلِ تغیر اعیان ہی کا ہے۔

نو افلاطونیت[1] : افلاطون کے بعد رومان میں سکندرِ اعظم کے استاد ارسطو کا دور آیا اور پھر وہ دور شروع ہوا جسے وسطی افلاطونی فلسفے کا دور کہا جاتا ہے۔ برٹرینڈ رسل کے بقول جس کی خصوصیت یہ تھی کہ ارسطو کے بعد کوئی فلسفی تارک الدنیا ہو گیا[2] وسطی افلاطونی فلسفہ انتخابی فلسفہ تھا جو رواقی اور افلاطونی فلسفے کے ساتھ ساتھ ارسطو اور فیثا غورث کے فلسفے سے بھی بہرہ مند ہوا۔ اس انتخابی فلسفے کی ایک شاخ نو افلاطونیت (افلاطونیتِ جدیدہ یا اشراق) ہے جس کا مرتب کرنے والا افلاطینس[3] تھا۔

پلائی نیوس یا افلاطینس، افلاطون کے فلسفے کا دل دادہ تھا، لیکن اسے افلاطون کا حلقہ بگوش نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا انداز فکر یہ نظر آتا ہے کہ افلاطون کا مقلد بھی تھا اور قلادۂ تقلید توڑ کر آزادانہ طور سے غور کرنے کا حامی بھی۔ پھر یہ بھی قرین از قیاس ہے کہ وہ افلاطون سے کہیں زیادہ اپنے استاد "امونیوس ساکاس" سے متاثر ہوا ہوگا جو عیسائی مذہب ترک کر کے وسطی افلاطونی فلاسفہ کے حلقے میں داخل ہو گیا تھا[4]

نو افلاطونیت میں جسم و جسمانیت کی اہمیت کیا ہے؟ اس کا جواب حاصل

کرنے سے پہلے فلاطینس کے نظریات کی تشکیل کے پس منظر کو دیکھنا چاہئے جس کا ایک رُخ تو اس کی تربیتِ فکر اور دوسرا رُخ اس کی کمزور صحت نیز زندگی کا زمانہ وہ معاشرہ تھا جس میں اس نے دن گزارے۔ فلاطینس کی صحت بے حد خراب تھی۔ وہ ضعفِ بصارت کے ساتھ ساتھ جذام میں بھی مبتلا تھا۔ نیز وہ زمانہ جس میں اُس نے عمرِ بسر کی، وہ بطوالیف ملوکی تھا اس کی تاریخ کچھ پہلے رومۃ الکبریٰ کی فوج بادشاہ گر بن چکی تھی اور جسے چاہتی تھی اٹھا کر بادشاہ بنا دیتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے دور میں فلسفی فلاطینس مسیحیت کی یہی تعلیم دے سکتا تھا کہ جو لوگ دنیا میں پھنسے ہوئے ہیں وہ تو جسم کی توانائی اور خوب صورتی کو بھی حاصلِ زیست سمجھتے ہیں اور دولت و حاجت کو بھی لیکن جو لوگ نیک ہیں اور انہیں یہ دونوں باتیں حاصل ہیں تو وہ ان کو عذاب کا سبب سمجھتے ہیں کہ ان کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں نیکوکار انسان اپنی تندرستی کی طرف سے غافل تو نہیں ہوتا مگر اس کی یہ خواہش ضرور ہوتی ہے کہ "وہ کبھی کبھی بیمار پڑے ... تاکہ اُسے جسم سے ضرورت سے زیادہ محبت نہ ہو۔"

فلاطینس کے بقول روح کی نجات کے لئے امر لازمی ہے کہ وہ اس قدر پاک ہو جائے کہ اُسے مادی خواہشات اور خیالات سے حاصل ہونی نہ رہے۔ اس نجاست سے طہارت کی صورت ممکن ہے کہ روح عقلِ اوّل کی ہو کر رہ جائے اور مادی خواہشات و خیالات سے کوئی سروکار نہ رکھے۔[۵۱]

طالب مصنوی کے بقول فلاطینس کا یہ معجون مرکب فلسفہ ایک ایسا مائدہ

لذت درد ہے۔ جس سے مشرق و مغرب کے ان تمام طریقوں کا کام بقدر سبو و دنداں نکلا جو تیسری صدی عیسوی کے بعد معرض وجود میں آئے اور جن کا دارومدار حقیقۃً تلسفے پر نہیں بلکہ وجدان پر ہے ۱؎ اس سے صوفیائے کرام کے اصحاب صحو کا کام بھی نکلا ہے اور اصحاب سکرہ کا بھی ۲؎ اس قول کی روشنی میں حقیقت کچھ اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ رہبانیت پسندوں پر فلاطون کے تصورات کی جو چھاپ نظر آتی ہے وہ دراصل نو افلاطونیت کے سانچے کی ڈھلی ہوئی ہے۔

اس باب میں لفظ "تصوف" کا استعمال بھی وضاحت طلب ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اقبال تصوف کو بھی مسلک گوسفندی اور طریق اذکار رفتگاں سمجھتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کیونکہ اقبال کی نظم و نثر اور زیر نظر مثنوی ہی میں ایسی کئی مثالیں نظر آتی ہیں جو حقیقی تصوف اور سچے صوفی کے مقام کی رفعت ظاہر کر دینے کے لئے کافی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سچے مسلمان صوفی وہ بزرگان دین تھے جنہوں نے نو افلاطونیت کے بخلاف رہبانیت یا ترک دنیا سے اجتناب کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ نگاہیں ان کی شان فقر اور رہبانیت کا فرق دیکھنے سے قاصر رہی ہوں" یہ انصار صفت درویش اور قلندر جن کے نہاں خانۂ دل میں اللہ کی محبت کے بعد اگر کسی کی محبت تھی تو وہ اس کے رسول اور نبیؐ تھے۔ اُن کو اپنے رسول اور نبیؐ کا بتایا ہوا یہ سبق ہمیشہ یاد رہتا تھا کہ عاشق اپنے معشوق اور محبوب کا رنگ ڈھنگ اختیار کرتا ہے (تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہ) اس کو اپنے محبوب کی خصلتوں سے بھی ایسا ہی عشق ہوتا ہے جیسا اپنے محبوب سے ۳؎ خود ہادیٔ برحق

حضور نبی کریم ہدایت کا نمونہ ہے اللہ کی خصلتیں اپنے اندر پیدا کر چکے تھے۔
لہٰذا ان پر ہمارا فرض تھا کہ وہ حضور نبی کریم کی تقلید
کریں اور اتباع سنت نبوی کا معیار ان کو بنا کر دکھائیں۔ اب رہا یہ سوال کہ
حضور کی سنت مبارکہ کیا ہے جو ہمارا فرض ہے کہ ترک دنیا یا رہبانیت
حضور کی سنت نہیں ہے۔

اقبال نے تصوف سے اتنی بیزاری ظاہر کی کہ وہ زندگی سے گریز سکھاتا
ہے۔ وہ افلاطونی اعیان، تاشقرد، اور اس قسم کے فلسفہ حیات کو جو اس پر
مبنی ہے اسلامی اور قوم پرستی قرار دیتے ہیں۔ اب بعض ایرانی تصوروں اور ان کے
اجتماعی مضمرات کو بیان کرنے کی خیال کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ عقل انسانی
کیلئے چاہے کتنے ہی تابناک کیوں نہ ہوں لیکن بے حد تخریبی ہونے کے باعث
جماعت کے تخلیقی قوتوں کو ختم کر سکتے ہیں۔

اقبال نے تصوف کے خلاف جس کی بنا پر جس کی وجہ سے ذہن اور
فطرت بالکل ایک دوسرے سے الگ ہو جاتا ہے۔ مذہبی اور اندرونی حقیقت
ایک دوسرے میں محو ہو جاتی ہے اور ان میں ایک قسم کا عملی تعلق ہوتا
ہے جو ہر حالت میں قائم رہتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو افلاطونی اور
افلاطونی اسلام کے خلاف اقبال نے اپنی تصورات کو عقل کی حکمت
[illegible] کیا ہے۔ یہ حالت اعیان سے زیادہ عام امکان کے حقائق و
[illegible] کی کوشش کی ہے۔ اسی باعث وہ ان اصولوں سے اختلاف کرتے
ہیں جو ذہنی حقائق سے برسرپیکار ہیں اور حرکت و عمل کے بجائے سکون و

جمود کی طرف راغب کرتے ہیں۔ وہ اس رہبانی نقطۂ نظر کے خلاف ہے جو انسانی خواہشوں کو روحانی ترقی کا دشمن خیال کرتا ہے۔ خواہشوں کی تہذیب و زبردست قوتیں پوشیدہ ہوتی ہیں ان کو مٹانے کے بجائے ان میں روحانی ضبط سے ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے اور انہیں اعلیٰ مقاصد کے لئے وقف کیا جا سکتا ہے۔ خواہش اور ارادے کا ضبط بڑی نیکی ہے اور اخلاق اسی سے عبارت ہے۔ اقبال کے نزدیک کرامت کے افسانہ و افسوں سے زیادہ اہم ممکناتِ حیات کا اظہار ہے جو سعی و عمل اور عرفانِ ذات پر منحصر ہے۔ اُن کے بقول:

تری نگاہ میں ہے معجزات کی دنیا — مری نگاہ میں ہے حادثات کی دنیا
عجب نہیں کہ بدل دے اسے نگاہ تری — بلا رہی ہے تجھے ممکنات کی دنیا

ایک اور جگہ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ اگر ذکر نیم شبی اور مراقبوں سے خودی کی نگہبانی نہ ہوتی ہو تو کچھ فائدہ نہیں۔

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علمِ لاہوتی — حرم کے درد کا درماں نہیں تو کفر ہے یہ
یہ ذکرِ نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور — تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

تصوف کے خیالات جو شاعری کے ذریعہ اسلامی ملکوں میں پھیلے اُن میں زندگی سے گریز کی وہی تعلیم تھی جو غزالی اور انحطاط کے زمانے میں پیدا ہو جاتی ہے۔ تاتاری حملے کے بعد اسلامی ملکوں میں جو عام مایوسی اور زندگی سے بیزاری پھیلی ہوئی تھی اس کی نسبت اقبال نے کہا ہے کہ:

"یہ حیرت کی بات ہے کہ تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور یہی ہونا بھی چاہیئے تھا جس قوم میں طاقت و

توانائی مفقود ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو پھر صرف یہ ہی نقطۂ نگاہ بدل جاتا ہے۔ اُن کے نزدیک توانائی حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے۔ ترکِ دنیا موجبِ تسکین ..... (اقبال نامہ صفحہ ۴۴-۴۵)

اقبال اس قسم کے تصوف اور اس پر مبنی شعر و ادب کے خلاف ہیں۔ وہ اس صحیح اسلامی تصوف کے خلاف نہیں ہیں جو حرکت اور تغیر کے اصول سے قوت حاصل کرتا ہے اور جس میں بے عملی کے جمود کے بجائے عمل کی وہ خالص اور پاکیزہ ترین صورت ملتی ہے جو قرآنی تعلیم پر مبنی ہے۔ [۱]

نواں باب

حقیقتِ شعر اور اصطلاحِ ادبیاتِ اسلامیہ

سرودِ شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر — گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیرِ بندۂ خاکی ہے مطمحِ ان کی — بلند تر ہے ستاروں سے اس کا کاشانہ
خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات — نہ کر سکیں تو سراپا فسونِ و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک اُمتوں کی رسوائی — خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

کسی قوم کی روحانی صحت کا دار و مدار اُس کے شعرا اور آرٹسٹ کی الہامی

صلاحیت پر ہوتا ہے۔ لیکن یہ ایسی چیز نہیں کہ جس پر کسی کو قابو حاصل ہو۔ یہ ایک عطیہ ہے جس کی خاصیت اور تاثیر کے متعلق اس کا پانے والا اس وقت تک تنقیدی نظر نہیں ڈال سکتا جب تک وہ اسے حاصل نہ کر چکا ہو۔ اس عطیے سے فیض یاب ہونے والے کی شخصیت اور خود اس عطیے کی حیات بخش تاثیر انسانیت کے لیے اہمیت رکھتی ہے۔ کسی روان پذیر آرٹسٹ کی تخلیقی تحریک۔ اگر اس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنے نغمے یا تصویر سے لوگوں کے دلوں کو لبھا سکے، قوم کے لیے اٹیلا یا چنگیز خاں کے لشکروں سے زیادہ تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔[1]

رسولِ کریمؐ نے امرا القیس کے متعلق جو قبل اسلام کا سب سے بڑا شاعر گزرا ہے فرمایا تھا:

شعر الشعراء و قائدہم فی النار یعنی وہ شاعروں کا سردار ہے۔ لیکن جہنم کی راہ پر وہی ان کا رہبر ہوگا۔"

نری کو اس کا موضع دینا کہ وہ غیر مرئی کی تشکیل کرے اور فطرت کے ساتھ ایسا تعلق قائم کرنا جسے سائنس کی زبان میں مطابقت یا توافق کہتے ہیں۔ دراصل یہ تسلیم کرنے کے مترادف ہے کہ فطرت نے روحِ انسانی پر غلبہ پا لیا۔ انسانی فطرت کا راز یہ ہے کہ فطرت کے بہیمی جذبات کے خلاف مقاومت اختیار کی جائے نہ کہ ان کے عمل کے سامنے اپنے آپ کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ جو کچھ موجود ہے اس کی مقاومت اس واسطے کرنی چاہیئے کہ جو موجود نہیں ہے اس کی تخلیق ہو۔ ایسا کرنا صحت و زندگی سے عبارت ہے۔ جو آرٹسٹ زندگی کا مقابلہ کرتا ہے

"انسانیت کے لئے باعثِ برکت بنے"[۱]

"آرٹسٹ کی بدولت فطرت کے مہمل طور طریق میں ترتیب اور معنی پیدا ہوتے ہیں۔ آرٹسٹ کی زندگی دو دنیاؤں میں بسر ہوتی ہے ایک اُس کے تخیل کی دنیا اور ایک خارجی عالمِ فطرت۔ اصلی آرٹسٹ خارجی عالم کی نقل دار نہیں بلکہ تخلیقی کو اپنے رنگ میں رنگ سمجھتا ہے۔ بخلاف اس کے وہ اس کی پُراسرار روح کو تسخیر کرنا چاہتا ہے۔ فطرت نقل کے لئے نہیں بلکہ توجیہہ کے لئے ہے۔ کائنات اظہارِ توجیہہ کے لئے ہے۔ شاعر اس کام کو انجام دیتے ہیں۔ ہر بڑے شاعر کے کلام کی تہہ میں آرٹ کا ایک مخصوص تصور کارفرما ہوتا ہے جو بڑی حد تک اس کے کائنات کے تصور کے تابع ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک آرٹ خودی کے اظہار کا وسیلہ ہوتا ہے۔ وہ آرٹ جس میں خودی باقی نہیں رہتی کوئی مستحسن چیز نہیں۔ "آرٹسٹ" اپنے آرٹ کے ذریعے زندگی کے اظہار کا آرزومند ہوتا ہے۔ آرٹ زندگی سے علیحدہ کوئی قدر کی چیز نہیں اس لئے آرٹسٹ کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندگی کا دور سے تماشا کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس کی دوڑ دھوپ میں خود بھی شریک ہو۔ جو آرٹسٹ زندگی سے دور ہے اس کی تخلیق لازمی طور پر مصنوعی بے جان اور غیر حقیقی ہوگی۔"[۲]

اس باب میں اقبال نے شاعر کے سینے کو تجلی زارِ حسن کہا ہے۔ ان کے بقول شاعر کی بادہ سے خوب، خوب تر بنتا ہے۔ اس کے آب و گل میں بحر و بر اور ہوا کے دل میں سیکڑوں جہانِ تازہ پوشیدہ ہوتے ہیں۔ البتہ زوال پذیر قوموں کے شاعر ذوقِ حیات سے عاری ہونے کے باعث اپنے فن و ادب کی

افیم سے قوم کے اعصاب کو مفلوج کر دیتے ہیں اور اُن کی جادوگری سے قوس قزح کو زندگی سمجھ لیتی ہیں۔ اقبال ہر فن کار اور بالخصوص مسلمان فنکاروں کو ہدایت کرتے ہیں کہ انہیں اپنی گرہ کے نقدِ سخن کو زندگی کی کسوٹی پر جانچنا چاہیئے اور اس کی پرکھ کے لئے خودی کو معیار بنانا چاہیئے تاکہ ادب میں مفید صالح نمودار ہو۔ اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے وہ ملت کے فن کاروں کو چمن زارِ نجم سے نکل کر ریگ زارِ عرب میں جانے کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ وہاں زندگی کی دوڑ دھوپ میں شریک ہو کر وہ اصلی۔ جان دار اور نیک ادب کی تخلیق کر سکیں۔

دسواں باب

تربیتِ خودی کے تین مرحلے ہیں۔ پہلے کا نام اطاعت دوسرے کا ضبطِ نفس اور تیسرے مرحلے کا نام نیابتِ الٰہی ہے

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز
یہی ہے سرِ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشتِ شعیب و شبانیٔ شب و روز[۵۱]

قرآن مجید کے الفاظ میں آزاد شخصیت کے عطیے کو امانت کہا گیا ہے۔

تو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کو پیش کیا گیا تو وہ اس کے متحمل نہ ہو سکے البتہ انسان نے حوصلے سے یہ ذمہ داری قبول کر لی اور تمام اُسے وہ سنگین اور صبر آزما فرشتات و مصائب قبول کرنا پڑے جو اس امانت سے متعلق ہونے کے باعث المیہ حیات کو تکمیل کر دیتے ہیں مگر انہیں کے رویہ یہ بھی ممکن ہوتا ہے کہ انسان کی قوت کے ممکنات، آزمائش کی راہ پر لگ کر نشوونما پا سکیں۔ اس طرح حیات انسان کو تمام مخلوقات میں بلند ترین درجہ دیتی ہے یہی اُسے زمین پر اتارنا مقصد ہے۔

دنیا کے سب ہی بڑے بڑے مفکروں کا طرز اقبال کا خیال بھی یہی ہے کہ فرد کی قوت کے ممکنات آزادی کے ماحول ہی میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔ فالتیت یا انسان کا بلند ترین مقصد بننے کی دعوت سے اللہ کے قریب لے آتی ہے اور یہ آزادیت جبر ہر ترقی پسند تبدیلی کی پہلی شرط ہے۔ اپنے پھولنے پھلنے کے لئے آزادی کا ماحول چاہتی ہے لیکن خود سری اور آزادی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اقبال آزاد شخصیت کو بے مہار شخصیت نہیں سمجھتے چنانچہ وہ جہاں مرد حر کی تعریف یہ بیان کرتے ہیں کہ:

دم بدم نو آفرینی کار حر — نغمہ پیہم تازہ زیر و تار حر
فطرتش از تست کش کم از نیست — بندہ او خالق و آقا نیست

وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ شخصیت جب تک تربیت کے مرحلوں سے نہیں گزرتی حقانیت اور ایجادیت کی طرف مائل نہیں ہو سکتی بہ الفاظ دگر تربیت نہ پانے والی شخصیتیں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لا سکتیں اقبال کے لفظوں

آدمی کا نفس، خود پرور اونٹ کے مانند ہے جو خود سر اور خود پرست ہوتا ہے لیکن اس کی مہار قابو میں رہ سکتی ہے مگر ایسا ہو تو یہی نفس، خدمت شعار اور محنت کش بن کر صبر و استقلال کے ساتھ زندگی کے صحرائے پُر آشوب سے گزرتا ہوا انسان کو نیابتِ الٰہی کی منزل تک پہنچا دیتا ہے یعنی اس منزل پر لے آتا ہے جہاں انسان خالقیت اور ایجادیت کی کاریگری کے ذریعہ اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرتا ہوا منشائے ربانی سے ہم آہنگ ہو کر کائنات کی تکمیل و تزئین کے عمل میں حصہ لیتا ہے اور خود کو "اللہ کا خلیفہ" ثابت کر سکتا ہے۔ اس منزل تک پہنچنے کے لئے جس تربیت کی ضرورت ہے اس کا پہلا مرحلہ اطاعت ہے۔

اطاعت

اختیار کی منزل جبر کو گلے لگائے بغیر نہیں ملتی۔ بظاہر اس قول سے خودی کی نفی کا پہلو نکلتا ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آدمی کو وہ جبر کبھی قبول نہیں کرنا چاہیے جو اسے کسی اقتدارِ اعلیٰ کے مفادات کا غلام بنا دے لیکن اقبال جس جبر کو پسند کرتے اس کا دوسرا نام ربّ العالمین کے بنائے ہوئے آئین کا پابند ہونا ہے جس کی ہر دفعہ کا منشا آدمی کو خود ساختہ قولوں کے پنجے سے نکال کر نیابتِ الٰہی کے منصب پر فائز کرنا ہے۔ اس جبر کو اپنانا آدمی کے اختیار میں ہے کیوں کہ اللہ کے عدل کی شان یہ ہے کہ وہ اپنی اطاعت کیلئے بھی کسی کو استبدادی انداز سے مجبور نہیں کرتا اس لئے کسی خودی کے مضمحل ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ساتھ خودی کی یہ ادا بھی قابلِ غور ہے کہ:-

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز بھی ہو تو بے لذتِ نیاز نہیں[1]

کائنات کی ہر شے دینِ فطرت کی پابند ہے یہاں تک کہ :-

سبزہ بر دینِ نمو رویدہ است
پائمال از ترکِ آں گردیدہ است[2]

اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے اقبال کا خیال ہے کہ آدمی کی شخصیت، دینِ فطرت یعنی اسلام کے دستور پر عمل کرنے سے ہی محفوظ رہتی ہے اور ترقی کر سکتی ہے لہٰذا وہ ہدایت کرتے ہیں کہ :-

شکوہ سنجِ سختیِ آئینِ مشو
از حدودِ مصطفیٰ بیروں مرو[3]

ضبطِ نفس

تربیتِ خودی کی راہ میں دوسرا مرحلہ ضبطِ نفس کا ہے اس مرحلے پر اطاعتِ آئینِ ربانی کے احساس و شعور کے تحت نفس کے خود سر تقاضے نظم و ضبط کی حدود میں آ جاتے ہیں۔ جسم پر روح کے لئے طمع اور خوف جن کی لگامیں ڈالتے آدمی کو ہر وقت گمراہ کرنے پر آمادہ رہتی ہے۔ بے رفتہ رفتہ اس کے راستے سے دور ہو جاتے ہیں۔ بے وجہ ان کی یہ حیثیت بدلتی ہے۔ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی عبادت [illegible] اس کے مدد کو آ جاتی ہیں اور آدمی کے قدم صراطِ مستقیم پر جمے رہتے ہیں اس طرح خودی اور خود پرستی پامال اس کا نفس مستقل مزاج محنت کش اور صابر بن

جاتا ہے۔ وہ نظم و ضبط کی حدود میں آکر ہنسی خوشی بارِ فرائض اٹھاتا ہے اور ایک عالمِ سرخوشی میں آگے بڑھتے بڑھتے نیابتِ الٰہی کی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

نیابتِ الٰہی

اسلام کے پیش کردہ نظریات کی روشنی میں آدمی، نہ تو خدا کی اولاد سمجھا جاتا ہے اور نہ اس میں اللہ کے وجود کا کوئی جزو نظر آتا ہے۔ اسلام کی تعلیمات، اللہ اور آدمی کے درمیان جس گراں قدر نسبت کا اظہار کرتی ہیں اس کا نام "زمین پر اللہ کی نیابت" ہے یا قرآن مجید کے الفاظ میں یہ کہ آدمی اللہ کا خلیفہ ہے۔

یہ منصب آدمی کو بے وجہ نہیں ملا۔ قرآن مجید کے ارشاد کے بموجب چونکہ اللہ کی مخلوقات میں صرف آدمی ہی صاحبِ علم ہے اس لیے بس وہی اس لائق ہے کہ اس منصب پر فائز ہو۔[1]

دراصل آدمی اپنے مزاج کے الماسِ ناتراشیدہ میں احساس و اختیار کے وہ پہلو رکھتا ہے جنہیں اطاعتِ آئینِ ربانی اور ضبطِ نفس، منشائے الٰہی کے مطابق تراش کر اسے اللہ کا نائب بنا دیتے ہیں اور تب چشمِ فلک اس کی یہ شان دیکھتی ہے کہ:-

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد — حسن مرزیر کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہانِ دگرے — خودگرے خودشکنے خودنگرے پیدا شد
حرفے رفت کہ گردوں ز امانت نہ کشید — عذرا ے پیدا شد و دردے پیدا شد

آرزو ہے خیز اندیشہ یہ آغوشِ حیات ہنوز مادر دہانِ دگر سے پیدا شد[۱]

اقبال کے تصور کے مطابق انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے۔ وہ انسانیت کا وہ مقصود ہے جو اعتبار جسم، نفس، روح و حیات یعنی عقل و عشق کے امتزاج سے ہمارے حیاتِ نفسی کی پرورش اس کے وجود میں پایا جاتا ہے۔ اس کی خاص خصوصیت بلند ترین قوت کا رشتہ بلند ترین خیال سے ہوتا ہے اور اس کی عقل و جبلت، فکر و عمل گھل مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ وہ جو انسانیت کا آخری نمونہ ہے جس کا وجود ارتقائے پیہم مصائب کی تمام آزمائشوں کو حق بجانب قرار دیتا ہے۔ آخر الامر اسے ہی خلیفہ بننا ہے اور وہی نوعِ انسانی کا حقیقی حکمراں ہے۔ اس کی سلطنت زمین پر اللہ کی سلطنت ہے۔[۲]

اقبال عصرِ حاضر کے لئے اسی نائب الٰہی۔ اسی سوار اشہب دوراں اور فروغِ دیدۂ امکاں کے منتظر ہیں جس کا ظہور شورشِ اقوام کی خاموشی کا باعث ہوگا اور جو جنگ بازوں کو پیغامِ صلح دے کر قانونِ اخوت کی روشنی میں زندگی کی نئی تعبیر پیش کرے گا۔ کیونکہ:

دنیا کو ہے اس مہدیِ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نظر زلزلۂ عالمِ افکار[۳]

گیارہواں باب

شرحِ اسرارِ اسمائے علی مرتضےٰ رضؓ

اس باب کا موضوع حضرت علی رضؓ ابن ابی طالب کے ناموں کی تشریح ہے۔ اقبال کے بقول حضرت علی رضؓ اطاعتِ آئینِ الٰہی اور ضبطِ نفس کے مرحلوں سے گزر کر اس مرتبے پر پہنچ گئے تھے کہ اللہ نے انہیں "اپنا ہاتھ" اور حضور نبی کریمؐ نے "دروازۂ شہرِ علوم" فرمایا۔ ان کی ذات یداللہی کی مظہر ہے[1] اسی وجہ سے وہ خیبر کے ناقابلِ تسخیر قلعہ کا دروازہ توڑ کر اُسے فتح کر سکے اور وہی حشر کے دن حوضِ کوثر پر پیاسوں کو سیراب کریں گے۔

اقبال کے تصور کے مطابق نفس کے سرکش تقاضے "خاک" یعنی مادے کی مخصوص سرشت کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ ان کو مطیع کرنے کے لیے جسم کے موہوم زور مطالبات پر غالب پانا ضروری ہے۔ حضرت علی رضؓ نے چونکہ انہیں اپنے بس میں کر لیا تھا، اس لئے ان کا لقب ابوتراب (خاک کا باپ) ہوا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی مادی قوتوں کا آقا بن جاتا ہے اور ان سے جس طرح چاہے کام لے سکتا ہے۔ اس منزل پر پہنچ جانے کے بعد ہی وہ اپنی قوت کے ممکنات کا اظہار کر سکتا ہے اور اگر مزاجِ جہاں اس سے موافقت نہ کرے تو موجودات کی ترکیب کہن بدل کر انہیں اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔

حضرت علی مرتضیٰ رضؓ اسی اعجاز گر مقام پر پہنچ گئے تھے اور یہ انہیں کی ذات والاصفات تھی جس کے لئے ڈوبتے سورج کو وقت عصر تک واپس آنا پڑا تھا۔ اس واقعہ کو روایتوں میں "رجعتِ خورشید" یا "عودِ شمس" کا نام دیا گیا ہے[1]

چونکہ اقلیم تن کو فتح کر چکے تھے، اس لئے کرار اور خیبر دار تھے اور اسی لئے جہادِ زندگانی کے ہر میدان میں فتح ان کے قدم چومتی تھی۔

اقبالؔ کے بقول حضرت علی مرتضےٰ رضؓ کی ذاتِ گرامی بہ اعتبارِ پیمانۂ حیات انتہائی تربیت یافتہ شخصیت کی حامل ہے اور ان کے کاموں کی اہمیت اور معنویت سمجھنے کے لئے زندگی کے رموز سے واقف ہونا ضروری ہے۔

بارہواں باب

حکایت

مَرو کا ایک نوجوان حضرت سیّد مخدوم علی ہجویریؒ کی خدمت میں آیا اور دشمنوں کے ظلم کا شکوہ کیا۔

حضرت ابوالحسن علی بن عثمان بن علی الغزنوی الجلابی الہجویریؒ غزنی کے رہنے والے تھے۔ آخر عمر میں آپ کا قیام لاہور میں تھا۔ ۱۰۷۲ء سے ۱۰۷۶ء تک کے درمیان کسی سنہ میں وفات پائی۔ مزار مبارک لاہور میں ہے۔ آپ کی شاہکار تصنیف "کشف المحجوب" تصوّف پر قدیم ترین تصنیف سمجھی جاتی ہے جس کا منشا تصوّف کے مکمل نظام کو پیش کرنا اور دینیاتی معتقدات کو تصوّف کے ترقی یافتہ تصورات سے ہم آہنگ کرنا ہے۔ آپ نے اس تصوّر کی سختی سے مخالفت کی ہے کہ انسان کی شخصیت وجود باری میں ضم ہو کر معدوم ہو سکتی ہے۔ آپ کی تعلیمات کا مرکزی خیال شخصیت کی استقامت اور مضبوطی ہے[1]

اس باب میں یہی موضوع حکایت کے بطور پیش کیا گیا ہے۔ اگلے اوراق

میں وضاحت کے لئے دو مکالمے اور کئی بیان کی گئی ہیں۔

اقبال اصطلاحِ خودی اور ذاتِ کردار کے نقیب ہیں اور ان کی حقیقت و اہمیت بطور تمثیل کرتے ہیں مثلاً:-

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھا بنت حوا

پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گزر اوقات

اک دوست نے بھونا ہوا تیتر اسے بھیجا

نہ پہ کہ وہ شاہد امی ترکیب سے ہوئی مات

یہ خوان تو ہے تو تو ہے تو ہے تو ہے

کہنے لگا وہ صاحب عرفان و لذت مات[۲]

اے مرغکِ بے پروا یہ تو بستاں تو

تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ جس کی مکافات

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو

دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات[۳]

ان منظومات کی روشنی میں اقبال پر تیسرے جرمِ ضعیفی کا اثر نمایاں معلوم ہوتا ہے اور یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کے مخصوص نقاطِ فکر و نظر معتزلی مفکرین بالخصوص نظام کے دینی تصورات میں ان کے تصورات کو ملنے کا عطایہ کہنے کی غلطی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ اقبال اور نظام کے نظریات فکر میں قدرے

مشابہت نظر آتی ہے مثلاً:- (۱) دونوں افلاطون کی مذمت کرتے ہیں۔
(۲) دونوں کے خیال کے بموجب آدمی کی شخصیت کو تین مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔
(۳) صلاحیتِ کردار کے موضوع کو دونوں نے ہیرے اور کوئلے کی کہانی سے واضح کیا ہے۔

اس مشابہت کے باوجود اقبال اور نطشے کے تصورات میں کوئی میل نہیں کیونکہ نطشے افلاطون کو اس لئے بُرا سمجھتا ہے کہ افلاطون سقراط کا پیرو ہے اور سقراط کے پیش کردہ نظامِ فکر میں جبلتوں کی رہنمائی کے بجائے عقل کے اشارات کو رہبر مانا گیا ہے جو نطشے کو پسند نہیں لیکن اقبال کی نظر میں افلاطون کے تصورات اس لئے قابلِ مذمت ہیں کہ وہ حیات کے بجائے موت اور فعال زندگی کے بجائے رہبانیت کی طرف لے جاتے ہیں۔ شخصیت کی تربیت کے معاملے میں نطشے کے بقول آدمی کو تین مرحلوں سے گزرنا ہوتا ہے جن میں علی الترتیب اونٹ، شیر اور آدمی کے بچے کی خصوصیات ملتی ہیں لیکن اقبال کی نظر میں یہ مرحلے اطاعتِ آئینِ الٰہی، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی کے ہیں۔ اب رہے گا ہیرے اور کوئلے کی کہانی باقی رہ جاتی ہے سو اس جرم کی پاداش میں کہ اقبال نے اُسے دوہرا دیا ہے اس کے تصورات کو نطشے کا عطیہ کہہ دینا ایک استبدادی فتوے کے علاوہ کچھ نہیں۔

اس باب میں یہ دلچسپ حقیقت بھی نمایاں ہوتی ہے کہ خودی کی تربیت کیلئے عداوتوں اور رقابتوں کا ماحول مبارک اور مفید ہے کیونکہ اگر شخصیت کمزور نہیں ہے تو رکاوٹوں سے ہراساں نہیں ہوگی۔ چڑھتے دریا راستے کی چٹانوں کو نظر میں نہیں لاتے بلکہ آبشاروں پر بنا تیرا اور بجلی کے ذخیرے مہیا کرتے ہوئے

آگے بڑھ جاتے ہیں۔ چوٹ دو، اور شکوہ شیشے کو ہو تو ہو پتھر کو نہیں ہوتا۔ لہٰذا اگر شخصیت بجز بحکام ہے تو دشمنی کے ماحول کو اپنے لئے سازگار بنا لیتی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ :-

جبر کہ دانائے مقامات خودی است
فقر حق دانا اگر بیشمن قوی است[1]

حکایت

اس چڑیا کی جو پیاس کے بیتاب تھی

(اس حکایت کا موضوع وہی ہے جو پچھلی حکایت کا تھا)

چڑے اور کوے کی کہانی :- ہوتے ہیں اس کے باوجود سیر انفسی سمجھا جاتا ہے اور کوے کی قدر سنبھل جاتی ہے۔ پچھلی دو حکایتوں کی طرح یہ کہانی بھی استحکام خودی اور جلالت کردار کی اہمیت کو واضح کرتی ہے۔ اقبال سے پہلے نطشے نے بھی اس کردار پر کلام کیا تھا جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے :

"اتنے سخت کیوں ہو؟" انگیٹھی کے کوئلے نے ایک دفعہ ہیرے سے کہا: "کیا ہم قریبی رشتے دار نہیں ہیں؟"

"تم اتنے نرم کیوں ہو؟ اے میرے بھائیو! میں تم سے پوچھتا ہوں کہ کیا تم میرے بھائی نہیں ہو؟ اتنے نرم، ایسے سپر انداز، اتنے خود سپرد کیوں ہو؟ تمہارے دل میں اتنا تردد اور انکار کیوں ہے؟ تمہاری نظر کا نصیب اتنا مختصر کیوں ہے؟

جب تک تم یہ نہ چاہو گے کہ فضائے لیے زرد بن جاؤ کیا تم کبھی بھی میرے ساتھ کچھ تسخیر کر سکو گے؟

اور اگر تمہاری سختی چمک نہ سکے گی کاٹ نہ سکے گی ٹکڑے ٹکڑے نہ کر سکے گی تو کیا تم کبھی بھی میرے ساتھ کچھ تخلیق کر سکو گے؟ کیونکہ خالق تو سبھی سخت ہوتے ہیں تمہیں تو اس میں لطف آنا چاہیے کہ صدیوں پر اپنا ہاتھ یوں جمانا جیسے موم پر جماتے ہیں تمہیں تو اس میں لطف آنا چاہیے کہ صدیوں کی ملتماء پر اپنا نقش اس طرح کندہ کر دو جیسے کانسی پر کیا جاتا ہے۔ کانسی سے زیادہ سخت اس سے زیادہ شان دار کیونکہ صرف شان دار ہی پوری طرح سخت ہوتے ہیں۔

یہی فرمانِ جدید۔ اے میرے بھائیو! میں تم پر نافذ کرتا ہوں کہ سخت بن جاؤ۔"

تیرھواں باب

حکایتِ شیخ و برہمن اور مکالمۂ گنگا و ہمالہ اس معنی میں کہ روایات مخصوصہ ملّیہ پر گرفت مضبوط رکھنے سے حیاتِ ملّیہ کا تسلسل برقرار رہتا ہے۔

زیرِ نظر باب میں مکالمۂ شیخ و برہمن کے مطالعہ کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون مثنوی رموزِ بے خودی میں بیان ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اسی باب کے دوسرے جزو یعنی مکالمۂ گنگا و ہمالہ کے مطالعہ کے بعد یہاں اس کے مقام کی اہمیت اس اعتبار سے ظاہر ہو جاتی ہے کہ ملّت کی مخصوص

روایات کا اہتمام و احترام تسلسلِ حیاتِ ملیہ ہی کے تحفظ کا ضامن نہیں ہوتا بلکہ فرد کی خودی کو بھی محفوظ رکھتا ہے کیونکہ فرد بہرحال جماعت ہی کا ایک رکن ہوتا ہے۔

روایت کے معانی میں پانی کھینچنا اور دوست کو پیش کرنا۔ اونٹ پر مشک باندھنا، رسّی ملنا۔ دوسرے کے الفاظ دہرانا۔ رشتہ۔ تاریخ، تذکرہ۔ حدیث اور حکایت شامل ہیں لہٰذا ان کی روشنی میں "روایت" کسی مخصوص گروہِ انسانی کا وہ رویہ معلوم ہوتی ہے جو وہ اپنے سماجی شعور کی تحریک پر مسلسل ظاہر کرتا یا پسند کرتا ہو۔ نہ ہر روایت کا آغاز حیات کی کسی نہ کسی قدرِ گراں کے تحفظ و اجرا کے لئے ہوتا ہے۔ مثلاً خانہ بدوشوں کی روایت جہاں خوارزمی کو لیا جائے تو اس کی جگہ میں "پانی کھینچ کر پیش کرنا" جھلکتا نظر آئے گا کیونکہ ایک صحرا نورد قبائلی معاشرے سے زندگی کا پہلا مطالبہ یہی ہو سکتا ہے کہ تپتے ہوئے ریگستان میں آدمی دوست اور دشمن کا امتیاز کئے بغیر ہر پریشان حال مسافر کو ایک کوزہ آب پیش کرے اور اس کی مدارات کو فرض سمجھے ورنہ ہر دشت پیما کا مقدر پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرنا ہوگا۔

اپنے عہد کے قریب سب کی روایتیں صحت مند اور حیات پرور ہوتی ہیں لیکن اس سے دور ہٹتے ہٹتے رسوم پیشہ تدریجاً بڑھ کر حیات کے مطالبے ہونے کے بجائے اس کے راستے کی رکاوٹ بن جاتی ہیں اور ان کی عطا کردہ سرگشتگی انسان کے لئے دردِ سر بن جاتی ہے۔

روایت کے ضمن میں اگر رسوم کا اندراج ہو جاتا ہے لیکن اقبال ان کا

فرق جانتے ہیں اور اس باب میں ایک روایت کی طرف اشارہ کر کے انہوں نے کارروائی شناخت کے مرحلے کو آسان بھی کر دیا ہے۔

ان کے خیال کے مطابق ملّتِ اسلامیہ کی روایات کے باب میں تزکِ رسالت سرِ فہرست ہے کیوں کہ ایک ملّت کے بطور مسلمانوں نے عقیدۂ "بودم عدم" میں اُلجھنا کبھی پسند نہیں کیا اور نہ کبھی فعال زندگی سے دستبرداری کا رویّہ اپنایا ہے۔ ان کی مخصوص روایت یہی ہے کہ لطائفِ اوتارِ سماوی کے بجائے وہ زمین کو چار چاند لگانے کی فکر میں رہے ہیں۔ روایت کے صحیح خدوخال پہچاننے کے لیے یہ ایک مثال کافی ہے۔

اس باب کا دوسرا حصّہ "مکالمۂ گنگا و ہمالہ" ہے جس کے مطالعے سے شبہ ہو سکتا ہے کہ اقبال ان اشعار میں اپنے نظریۂ حرکت و عمل کے خلاف اظہارِ خیال کر رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ ہمالہ اٹل ہونے کے باوجود بالیدگی سے عاری نہیں ہوا۔ وہ بھی کسی سوزشِ وجہد سے ملا ہے تب کہیں اس کا سینہ مخزنِ لعل و گوہر بنا۔ ایک خاموش جدّوجہد کے نتیجے ہی میں اس کی ہستی کو یہ رفعت نصیب ہوئی ہے کہ اس کا دامن بسترِ مہ و پرویں ہو سکا۔

ان اشعار سے یہ حقیقت البتہ ظاہر ہوتی ہے کہ اگر حرکت اور سعی و عمل کا رُخ فرد کی شخصیت یا ملّت کی جمعیت کو پراگندہ کر کے اُسے کالعدم کر دینے کی طرف ہے تو ایسی کوشش بدنام کنندہ نامِ جدّوجہد ہے۔

چودھواں باب

مسلمان کی حیات کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے اور وہ جہاد جس کی محرک ہوس ملک گیری ہو مذہب اسلام میں حرام ہے۔

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک
دینا کو ہے پیغامِ کلیم ازلی سے
صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
خس و خاشاک
"دیں" "مولوی" "ملا" "پیر" اس سے نہیں ڈرتے
ہو جس کی فقاہت میں نہ ہر زہر کا تریاک[1]

[illegible] زرق اور ہلاکت آفرینی کا [illegible] ہیں اور طاقت [illegible] دیگر [illegible] طبیعتوں [illegible] ہیں۔ یہ

خیال ایک بڑی غلط فہمی کا نتیجہ ہے اور اس غلط فہمی کا شکار وہ حضرات ہو جاتے ہیں جو اقبال اور نطشے کا مقلد سمجھتے ہیں ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان تمام بحثوں سے قطع نظر جو اس غلط فہمی کے ازالے کے لئے ہوتی رہتی ہیں، اسرارِ خودی کا یہ باب اور مذکورہ بالا چند اشعار ہی اقبال کو اس الزام سے بری کر دینے کے لئے کافی ہیں۔

یہاں ایک بار پھر نطشے اور اقبال کے نظریات کا فرق سامنے آ جاتا ہے جسے بیان کر دینا ضروری ہے۔

۱۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال طاقت کو پسند کرتے ہیں لیکن وابستہ دامانِ رحمۃ للعالمین اور وارفتہ سوز و سازِ عشق ہونے کی وجہ سے وہ ظلم کو ناپسند کرتے ہیں جبکہ نطشے سرے سے رحم کی صفت کو زوالِ نبوت اور ظلم کو پسندیدہ سمجھتا ہے

۲۔ اقبال علم و معرفت اور صبر و رعایت کو پسند کرتے ہیں مگر عفو و حیا کے قائل نہیں اور نطشے ان علم و معرفت کو کچلنے کا حق ہی نہیں دیتا۔

۳۔ اقبال شخصیت کو مظہرِ جمال و جلال دیکھنا چاہتے ہیں لیکن نطشے کے بقول طاقت ہی مظہرِ حسن و خیر ہے اور ان دونوں فلسفیوں میں یہ فرق اس لئے ہے کہ:-

اقبال حیات بعد الممات کے قائل ہیں اور نطشے اس کا منکر۔ نیز اقبال عاشقِ ذاتِ الٰہی ہیں اور نطشے ناواقف، تمام تر بے دینی۔

نطشے کے تصورات کو جب عظیم مقام [illegible] اطلاق قیود سے آزاد ہونا ضروری ہے۔ بخیر بیان سے بچنی چاہئیں، اقتدار سے باغی ہونا چاہئے، آج کی زندگی ہی کو زندگی ماننا چاہئے اور اسے ہوا کا جانتے ہوئے بھی اچھا سمجھنا چاہئے۔

[illegible] آرٹ اور حسن کا [illegible] ہے [illegible] کر دینا چاہیئے نیز گناہ
[illegible] جرم [illegible] کو [illegible] سے اتار [illegible]

[illegible] کے بجائے رحم دلی ایک [illegible] اختیار [illegible]
[illegible] کی [illegible] کا باعث [illegible]
[illegible] کی اہمیت ہے [illegible]

[illegible]

یہ مرد کامل ایک [illegible] ظالم، سادیت پسند اور [illegible] کا [illegible] ہے
جس کی زندگی کا مقصد تخریب برائے تخریب کے علاوہ کچھ نہیں۔

اس کے بجائے اقبال کے نظریہ مرد کامل یا مومن [illegible] باقی تا
پابند ہو [illegible] اخلاقی [illegible] رہتا ہے [illegible] زندگی کے
ایک اور [illegible] کا [illegible] اور خودی کی [illegible] محبت سے [illegible]
ہے اس کا مرد کامل [illegible] ہے [illegible]
جس [illegible] ہوتا ہے کہ اس کے
مقصد [illegible] کی [illegible] فائدہ [illegible]
[illegible] کے لئے [illegible]
[illegible] صرف [illegible] کرنا ہے [illegible] اصلاح [illegible]
[illegible] اقبال کے مرد
[illegible] کا [illegible] ہے کیونکہ وہ [illegible] اور [illegible] کا [illegible] ہوتا ہے۔ وہ دل بے نیاز
[illegible] اور [illegible] ہوتی

ہے کہ :-

بہ حلقہ یاراں تو بر سینہ ہم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن[۱۵]

ان اشارات کی روشنی میں اقبال اور فلسطینی افکار میں کوئی قابل ذکر مطابقت تلاش کرنا بے سود ہے۔ البتہ یہ کہنا کہ اقبال فلسطائیت پر مائل تھے۔ اقبال اور فلسطائیت دونوں سے بے خبر رہنے کی دلیل ہے۔

اس باب کے عنوان میں اقبال نے واضح کر دیا ہے کہ اسلام کی تعلیمات کے بموجب ملک گیری اور کشور کشائی کی ہوس پوری کرنے کے لئے میدانِ جنگ آراستہ کرنا حرام ہے۔ ایسی جنگوں کو جہاد نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے بقول تو حقیقت یہ ہے کہ :-

گر نہ گردد در حق ز تیغ ما بلند
جنگ باشد ذوق را نا ارجمند

ان اشعار میں شہاب الدین شاہجہاں کا ذکر کیا گیا ہے[۱۶] شاہجہاں دکن کی جنگوں میں فتح یاب ہونے کے لیے حضرت میاں میرؒ سے دعا کا طلب گار ہوا تھا لیکن حضرت شیخ نے [illegible] دینے کے بجائے یہ بتایا کہ وہ اپنی ہوسِ ملک گیری کو آرزوئے جہاد کہہ کر غلط فہمی اور خود فریبی میں مبتلا ہے۔ اقبال بھی اس قسم کے "مجاہدات" کی تبلیغ نہیں کرتے، انہیں خودکشی کے مترادف سمجھتے ہیں۔ [illegible] کا قول ہے کہ :-

ہر کہ خنجر بہر غیر اللہ کشید
تیغ او در سینۂ او آرمید[۱۷]

پندرہواں باب

پیر سخاوت اللہ شاہ قادری رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق جو ہندوستان کے علماء سے رہا

زندگی ہے اور شے ہے علم اور شے ہے شعور
زندگی کا راز ہے کچھ اور علم و شعور
علم کی دولت سے ہے محکم زمانہ کا نظام
ایک سے ایک ہے اس میں اپنا مقام
اہل دانش کا ہے یہ مذہب اور یہ ہے مسلک
کیا عجب ہے اہل دل کی رہ گیا ہے ایاغ
تیرگی میں ہے طلب انوار کا ہر دل میں شوق
کیا ہے یہ ہے روشن جو چراغ
پروفیسر حسن ابوالعلائی صاحب کا تعلق بندہ

فرضی نام اپنے لئے استعمال کیا ہے۔

اس باب کا موضوع ان ماضی کی تاریخ ہے جو قبل کے تصورات
بجوب وجد پالنے سے بیگانہ اور سوچ دل سے ماورا ہو جس سے باہر نہیں
جا سکتا۔ وہ ہر کوئی جب باطن تک اس کی رسائی نہیں ہوتی۔ اسے یہ معلوم
نہیں ہوتا کہ کیا ہے۔ اگر اس کے اندر سے ظاہر اور خفیہ خطرناک
ہوتے ہیں۔ اپنے تیار کیے ہوئے ان کی اصل حقیقت سے سب کو دیکھ چکے تھے
پناہ چاہیں اب پڑا۔

[illegible] کے قریب ایک مزار ہے جس پر مزار
بابت [illegible] لکھا [illegible] رشید الدین صاحب چاند پوری

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اس میں شک نہیں کہ یورپ اور امریکہ نے سائنس اور انجینئرنگ کے طفیل اتنی ترقی کر لی کہ آج کل کے انسان کے قدم چاند پر پہنچ گئے ہیں لیکن اس سچائی سے کبھی انکار ممکن نہیں کہ انہی ممالک نے انقلاب فرانس کی کوکھ سے اس سرمایہ دارانہ سامراج کو جنم دیا جس کا مقصد دنیا کی بیشتر آبادی کو اپنا غلام بنانا ہے۔

عقل اور سوچ والے ہر کام کی سعی بہت یہ کم عہد آزادی کی جگہ مشین کو دے چکے ہیں۔ اُن کے پورے نظام میں جو چیز مشین ہے بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ آدمی بھی مشین بن گیا ہے۔ ایک جان دار مشین بن گیا ہے جسے جانور بھی نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ جانور لذت و نادار اور بامروت ہو بھی سکتے ہیں لیکن :-

اسلام کے دامن میں مشینوں کی حکومت
انسان مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

یہ جان دار مشینیں مل جل کر نہیں رہ سکتیں۔ شانے سے شانہ ملا کر کام نہیں کر سکتیں، یہ صرف کچل سکتی ہیں۔ ٹکڑے ٹکڑے کر سکتی ہیں۔ پیس سکتی ہیں۔

اس زور کی ٹکر ٹوٹ گئی۔ زر کے جیتے۔ پیرانِ سب اس میں ہی تماشا نظر آیا

ہے ریل مشینوں نے چھوڑ شاہراہوں پہ لو پا کر چیختوں کے وہ وہ قربان جاری کئے ہیں
جن کی زد سے انسانیت، سیاست، تجارت، مذہب، شخصیت کچھ بھی محفوظ نہیں رہا۔ اب یہ ہے کہ اقبال کے لفظوں میں ذہنوں کو پیدا خ ہو لیکن نہ ہو۔ زبان پر تو مسوس ہونے لگی ۱۱ وہ کہ

اسکے کہ :-

[illegible]

[illegible]

[illegible]

واقف ہوتے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

اس باب کے تین حصے ہیں۔ پہلے میں استحکام خودی کی تلقین کرتے ہوئے علم اور عشق کا موازنہ پیش کیا گیا ہے اور تمثیل کے بطور صاحب حال حضرت شمس تبریز رح اور امیر قال مولانا جلال الدین رومی رح کا وہ واقعہ بیان کیا گیا ہے جس نے مولوی کو عشق کی راہ پر لگا دیا۔

دوسرے اور تیسرے حصے میں اس تکلیف دہ حقیقت کا اظہار ہے کہ آج مسلمان بھی علم دین کو نظر انداز کرنے کے باعث شرائط زندگی سے بھٹک گئے ہیں اور ان دنوں ان کا حال یہ ہے کہ :-

صوفی کی شریعت میں فقط مستی احوال
ملا کی شریعت میں فقط مستی گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق
افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستی کردار[۵۲]

لہٰذا اُن کے بقول یہ سوال قابل غور ہے کہ :-

چیست یاران بعد ازیں تدبیر ما
رُخ سوئے میخانہ دارد پیر ما[۵۳]

عولہواں باب

اوقات بیک (اوقات نگاری)

جو تھا نہیں ہے۔ جو ہے نہ ہوگا یہی ہے نغمۂ محمدیہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ
وہ نغمہ جس سے قطار اونٹوں کی ہو تو اونٹ رقص کرتے ہیں
میں اس تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں وہ زمانہ
ہر ایک سے آشنا ہوں لیکن جدا ہر اک سے جدا ہوں گویا
کسی کو دیکھا کسی کو دیکھا کسی کو دیکھا کسی کو دیکھا
نہ تھا اگر تو شریک محفل قصور میرا ہے یا کہ تیرا
مرا نشیمن نہیں ہے بکھرا کسی کی خاطر ہے آشیانہ
رہے نہ دنیا کو بے خبری کی خبر دینے والا
ہر نئے جیسا نہ تیرا اس کا نظر نہیں جس کی عارفانہ

اقبال کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ ان کا کلام ان کے ذوق کی تفسیر ہے۔ لیکن یہ ان کے کلام کی کیفیت ہے۔ ان کا ورود یا اثر ان کا تصور کا ان کا دل ہے۔ لیکن ہمیں ان کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نئی تصورات

لازم ملزوم ہیں۔ عرفانِ خودی کے لئے عرفانِ زمانہ درکار ہے اور زمانے کو سمجھنے کے لئے عرفانِ خودی لہٰذا جہاں اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی　　خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و عرش و کرسی　　خودی کی زد میں ہے ساری خدائی[۱]

وہیں زمانے کے اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ :-

بستہ ہر تدبیر با تقدیر من　　ناطق و صامت بہ تحسین من
غنچہ اندر شاخ می بالد ز من　　مرغک اندر آشیاں نالد ز من
دانہ از پہلوئے من گردد نہال　　ہر فراق از فیض من گردد وصال
ہم عتابے ہم خطابے آورم　　تشنہ سازم تا شرابے آورم
من حسابِ کم من و بیش کشور　　من حسابِ روز و شب در دشت و در
آدم و افلاک در بند من است　　عالم شش روزہ در کمند من است
ہر گلے کز شاخ می چینی ز من　　ام ہر چیزے کہ می بینی ز من
در طلسم من اسیر است این جہاں　　از دمم ہر لحظہ پیر است این جہاں[۲]

اقبال کے اقوال سے اسلامی تہذیب کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خالص ذہنی مسئلے ہوں یا مذہبی نفسیات یعنی اعلیٰ تصورات کے مسائل سب کا نصب العین اور مقصود یہی ہے کہ لامحدود کو محدود کے اندر سمو لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جس تہذیب کا مطمحِ نظر یہ ہو اس میں زمان و مکان کا سوال دراصل زندگی اور موت کا سوال ہے[۳]۔ زمانے کا دوسرا نام تقدیر ہے۔

"زمانے کو جب عضوی کل کی حیثیت سے دیکھا جائے تو قرآن کی زبان میں اسے تقدیر کہتے ہیں۔ لفظ تقدیر کی مسلمانوں کے یہاں اور غیر مسلموں میں بھی بالکل غلط تعبیر پیش کی گئی ہے۔

تقدیر زمانے ہی کی ایک شکل ہے جب کہ اس کے امکانات کے ظہور سے قبل اس پر نظر ڈالی جائے۔ یہ وہ زمانہ ہے جو مسلسلہ اسباب کے کھینچے سے آزاد ہو چکا ہو اور فہم منطقی جس پر اپنی مخصوص شکل عاید کر دیتی ہے۔ مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ تقدیر وہ زمانہ ہے جسے ہم محسوس کرتے ہیں نہ کہ وہ جس کا ہم تصور کرتے ہیں یا جس کا ہم حساب لگاتے ہیں۔ اگر آپ مجھ سے دریافت کریں کہ شاہ طہماسپ اور ہمایوں کیوں ہم عصر تھے تو میں اس کی کوئی علت پیش نہیں کر سکوں گا۔ اس کا جواب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ فطرت کی ماہیت کا تقاضا ہی یہ تھا کہ مستقبل کے لامتناہی امکانات میں ہمایوں اور طہماسپ کی زندگیاں جو امکانات ہی سے عبارت تھیں ساتھ ساتھ وقوع پذیر ہوں۔

زمانے کو جب تقدیر خیال کیا جاتا ہے تو وہ اشیاء کی ماہیت بن جاتا ہے چنانچہ قرآن کریم میں ہے: خلق کل شیٔ وقدرہ تقدیرا۔ یعنی اللہ نے ہر چیز کو خلق کیا۔ پھر اس کے لیے ایک تقدیر یا اندازہ مقرر کیا۔ لیکن کسی شے کی تقدیر کوئی بے دردانہ نصیب نہیں جو باہر سے سخت گیر آقا کی طرح حکم چلا رہا ہو۔ یہ تو کسی شے کی داخلی گہرائی اور رسائی کا نام ہے۔ ان ممکن الحصول امکانات کا نام جو اس کی فطرت کی گہرائی میں ہیں۔ اور کسی وجہ کے بغیر اپنے آپ کو [illegible] تبدیل کرتے رہتے ہیں لہٰذا مستقبل ہر فرد کیلئے ایک کشادہ میدانِ امکانات کے بطور

موجود ہے۔ یہ پہلے سے کسی مرتبہ اور محدود نظام وقت کی طرح نہیں پایا جاتا کیونکہ وقت یکساں لمحات کی تکرار کا نام نہیں جو شعوری مشاہدات کو وہم بنا ڈالتا ہو۔ یہ تو ایک تخلیقی پیہم کارکن ہے جو آزاد فعالیت بنز نشو و نما کا میدان ہمیشہ تیار کرتا ہے۔ اگر ہم ماضی، حال اور مستقبل کو وقت کیلئے لازمی قرار دے لیں تو ہمارے سامنے وقت کی تصویر ایک سیدھی شاہراہ کی سی بنتی ہے جس کا کچھ حصہ گویا ہم طے کر آئے ہیں اور کچھ طے کرنا باقی ہے۔ اس وقت کا تصور ایک زندہ اور تخلیقی پرورحرکت کے بطور سامنے نہیں آتا بلکہ ایک جامد امر مطلق کی طرح نظر آتا ہے جو اوپر کی طرف سے صورت پذیر کائناتی واقعات کے منظم تسلسل کا حامل ہو اور دیکھنے والے کے سامنے ان واقعات کو فلم کی تصویر پردے کی طرح مسلسل پیش کر رہا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ وقت کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ:

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات — سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ — جس سے بناتی ہے ذات ایک ردائے صفات[۳]

لیکن دراصل:-

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا — ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات[۴]

اقبال زمانے کی رو کو شب و روز سے مستغنی اور وقت کے مروجہ پیمانوں سے بے نیاز سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم جب وقت کے پیمانوں کی بات کرتے ہیں تو دراصل "زمان" کو "مکان" فرض کر بیٹھتے ہیں۔ یہ تصور غلط ہے۔ زمانہ تو لیس یک رو ہے یعنی ایک آزاد تخلیق پرور حرکت جس کا تجربہ ہمیں (شعوری طور پر) اپنی باطنی زندگی میں ہوتا ہے[۵]

[illegible] اُس ہمہ کائنات کی [illegible] کو دیکھ کر [illegible] و ثبات کے
[illegible] کو شدید [illegible] سمجھتی ہیں یا
[illegible] تخلیق میں تکرار اور اعادے کا تماشا دیکھتی ہیں، لیکن
[illegible] کے برعکس [illegible] کائنات متحرک اور سیماب پا نظر آتی ہے جس کے
باعث :

تغیر ناپذیر ہاروان وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ نمود

زمانے کی [illegible] جو لامحدود اور ازل سے ابد
تک [illegible] تعمیر و تشکیل میں مصروف رہتی ہے کیونکہ :

[illegible] پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

[illegible] ہونے کے بعد بھی
خود [illegible] ایام [illegible] کہ زمانے کی تخلیق پرور حرکت سے
[illegible] ہے البتہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جب
کوئی [illegible] کوئی ایک پیمانہ [illegible] خود زمانے کے
خلاف ہو جائے لیکن [illegible] ہو کر جامد اور غیر تخلیقی چلن اپنا لے تو خود ہی
[illegible] باقی ہے۔

[illegible]
زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

[illegible] زمانے سے مراد [illegible] کوئی پیمانہ [illegible]
ہے۔

اس باب کا عنوان "الوقتُ سیفٌ" حضرت امام شافعیؒ کا مقولہ ہے۔ امام موصوف آئمہ اربعہ میں شمار کیئے جاتے ہیں۔ آپ کا نام ابو عبداللہ محمد بن ادریس شافعی ہے اور آپ کا دورِ حیات ۱۵۰ھ سے ۲۰۴ھ تک رہا ہے۔ آپ حضرت امام مالکؒ کے شاگرد تھے اور فہم فقہ و حدیث میں کمال رکھتے تھے۔ شاعری۔ عروض و نحو۔ لغت اور تاریخ میں بھی کمال حاصل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ علمِ نجوم بھی سیکھا مگر اس سے کام نہیں لیا۔

وقت کے رمز کو جاننے کے لئے اس باب میں مندرجہ ذیل دو حدیثیں بیان کی گئی ہیں۔

لی مع اللہ وقتٌ لا یسعنی فیہ نبیٌ مرسلٌ ولا ملکٌ مقربٌ

(مجھے ذاتِ باری کے ساتھ ایسا وقت نصیب ہوا کہ اس میں نہ نبی مرسل اور نہ مقرب فرشتہ بار پا سکتا ہے) [1]

اس حدیث سے حضور نبی کریمؐ کے اس رتبے کا پتا ملتا ہے جب آنحضرتؐ زمانِ ربانی کی ان وسعتوں میں پہنچ گئے تھے جہاں ماضی، حال اور مستقبل اُس اکائی کے بطور سامنے ہوتے ہیں جسے ایک "اب" [2] کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا اور جس میں نہ کچھ نہ الا ممکنات و واقعاتِ عالم کو بہ یک جنبشِ نگاہ دیکھ لیتا ہے۔

کسی اور نبی مرسل یا مقرب فرشتے کا اس منزل تک پہنچنا اس لئے ناممکن کہا گیا ہے کہ زمانِ ربانی کے اندر حامِ جلوہ کے روبرو از خود رفتہ نہ ہونا انتہائی مستحکم اور مکمل شخصیت کے علاوہ اور کس کے بس کی بات ہے۔ ایسی شخصیت حضور نبی کریمؐ کی ذات ہی تھی کیونکہ مولانا عبدالقدوس گنگوہی کے بقول یہ کارنامہ

صرف حضور ﷺ سے ظاہر ہوا ہے کہ معراج کی انتہائی بلندیوں اور وسعتوں تک پہنچنے کے باوجود آپ خود سے نہیں گزرے بلکہ اس ازدحامِ جلوہ میں اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے اسی کارگاہِ عناصر اسی دنیائے آب و گل میں فیوضِ رسالت عام کرنے کیلئے واپس آگئے۔

حضرت امام شافعیؒ کے بقول "وقت تلوار ہے" جس کی کاٹ کا جواب نہیں لیکن تلوار چلانے کو آتی ہے وہ کوئی بے ہنر ہی ہوتا ہے جو اپنی تلوار سے خود زخمی ہو جائے متذکرہ بالا حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خود گیر شخصیتوں اور زمانے میں مخاصمت نہیں ہوتی ایسی حالت میں وقت کی تلوار اپنا قبضہ ان حضرات کو خود پیش کر دیتی ہے کبھی عصائے موسیٰ بن کر کبھی اللہ کے چلائے ہوئے تیر کی شکل میں اور کبھی ذوالفقارِ حیدری کی صورت میں یہ تلوار اجرائے منشائے الٰہی کے لئے ان حضرات کی حلیف بن جاتی ہے۔

دوسری حدیث حسبِ ذیل ہے:

لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَإِنَّ الدَّهْرَ هُوَ اللّٰهُ

زمانے کو برا مت کہو بے شک زمانہ اللہ ہے۔[۲]

اور مشکوٰۃ شریف میں یہ حدیث اس طرح موجود ہے۔

"وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالَى يُؤْذِينِي ابْنُ آدَمَ يَسُبُّ الدَّهْرَ وَأَنَا الدَّهْرُ بِيَدِي الْأَمْرُ أُقَلِّبُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ۔

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آدم کا بیٹا زمانے کو برا کہہ کر مجھ کو برا کہتا ہے۔ حالانکہ

زمانہ میں ہی ہوں۔ میرے ہی ہاتھ میں سب کچھ ہے میں ہی دن رات کو بدلتا رہتا ہوں۔ (بخاری و مسلم)[۱]

دُعا

اس ظاہر پرست دنیا میں دل کی بات کوئی نہیں سنتا۔ دل، انسان کو واقعی انسان بنا کر عشق کے ذریعہ عقل کی چیرہ دستیوں پر قابو پانا چاہتا ہے لیکن اس کا مشورہ ہنس کر ٹال دیا جاتا ہے۔ آدمیوں کے گروہ کے گروہ پتھروں کے ڈھیر معلوم ہوتے ہیں یا درندوں کے غول۔ اس حالت میں گنے چنے دل والے ہر دروازے پر دستک دیتے نظر آتے ہیں، آوازیں لگاتے سنائی دیتے ہیں "للہ ہوش میں آؤ خود کو پہچانو۔ لیکن یہ آوازیں صدا بصحرا ہوتی ہیں۔

دولتِ دل غارت کے سب ایک دوسرے سے اجنبی بنے رہتے ہیں۔
ان اشعار میں اقبالؔ اسی احساسِ تنہائی کا شکار نظر آتے ہیں۔ وہ
بزمِ محفل میں ایسے اکیلے ہیں جس کا کوئی رازدار نہیں کوئی غمگسار
نہیں۔ اس حالت میں یہ دعا ان کے دل سے نکلی ہے جو ہر صاحبِ احساس
کی دعا ہو سکتی ہے۔

خودی میں ڈوب زمانہ سے نا اُمید نہ ہو
کہ اس کا زخم ہے درپردہ اہتمامِ رفو

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی

مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ وہی آش

حلاج کی لیکن یہ روائت ہے کہ آخر

اک مردِ قلندر نے کیا رازِ خودی فاش

(اقبال)

اسرارِ خودی

(اُردو)

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت
شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

(مولانا جلال الدین رومیؒ)

کل شیخ چراغ لیے شہر کے گرد گھوم رہا تھا اور کہتا تھا "میں وحشیوں اور درندوں سے تنگ آگیا ہوں۔ مجھے انسان کی آرزو ہے۔

ان تھکے ہارے ساتھیوں سے تو میرا دل اکتا گیا
مجھے شیرِ خدا اور رستمِ دستاں کی آرزو ہے

میں نے کہا "وہ تو نہیں ملتا، ہم اسے تلاش کر چکے
اُس نے کہا۔ جو نہیں ملتا اسی کی تو مجھے آرزو ہے"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسرارِ خودی

تمہید

نیست در خشک و تر بیشۂ من کوتاہی
چوب ہر نخل کہ منبر نہ شود دار کنم

(نظیری نیشاپوری)

ٹوٹ گئے جب لیلیٰ شب کے گہر — میرے اشکوں سے ہوئے گل خوبتر
میرے آنسو خواب نرگس لے اڑے — جاگ اٹھا سبزہ مری فریاد سے
میرے ہی زورِ سخن سے باغباں — بو کے مصرع لے سا تیغِ زباں
باغ میں بس میرے آزاد ہو دیئے — آہوں کے پیوند پودوں کو دیئے
ذرہ ذرہ میں ہے بیتابی مری — ہمنفس رکھتا ہوں گریاں میں کئی

خاک میری رشکِ جامِ جم بھی ہے
ممکناتِ خلق کی محرم بھی ہے

تیغ میرے فکر نے وہ بھی کیا
آہوئے معنی جو نازائیدہ تھا

لیے اُگا سبزہ مرے گلشن میں ہے
پھول جو نکلا نہیں دامن میں ہے

میں نے بزمِ نغمہ کو برہم کیا
چھیڑ کر تارِ رگِ عالم ذرا

سازِ فطرت ہے مرا نادر نوا
دوست اس نغمے سے ہیں نا آشنا

میں جہاں میں مہرِ نو زائیدہ ہوں
رسم و آئینِ فلک نادیدہ ہوں

تارا میری تاب سے چمکا نہیں (۱) بے قرار اب تک مرا پارا نہیں

بحر پر رقصِ ضیا میرا کہاں
کوہ پر رنگِ حنا میرا کہاں

میری خوگر کب ہے چشمِ ہست و بود
مجھ کو لرزا دیتا ہے خوفِ نمود

صبح میری ہو گئی اور شب کٹی
ہے گلِ عالم پر اب شبنم تری

انتظارِ صبحِ خیزاں ہے تجھے
اب پجاری خوش ہوں میری آگ سے

بے نیازِ زخمہ اک نغمہ ہوں میں
ہاں نوائے شاعرِ فردا ہوں میں

ہے یہ دورِ اسرار سے نا آشنا
میرا یوسف کب ہے اس بازار کا

کچھ نہ کر پائیں گے یارانِ قدیم
طور ہے روشن مرا آئیں کلیم

مثلِ شبنم بحرِ یاراں بے خروش
میری شبنم ہے مگر طوفاں بدوش

ہے لب پہ جاں ہی اور ہے — اس جرس کا نالہ دل ہی اور ہے

ہے بت شاعر کر بے گئے — زندہ ہم کر کے گئے خود تل بے

پھر سے اے مایۂ ہستی بنے — اپنے ہی تے مثال گم آگے

کر دے ترے تلوں نالے — پھر چلے رہے

ہر بال ہے نقش بنا ہوں ایمان کا — تو رشتہ بیش خدمت ہے مرا

ہاں سنا دے گو نغمہ مرا — لوٹے یہ ساز مجھ کو خون کیا

قطرہ ہوں ساحل سے بیگانہ ہو — خوب لیکن بحر تو دریا نہ ہو

کیسے کہتے ہو دریا نہیں — میرے طوفاں کو سمندر چاہیں

ہو گئی کل کر نہ گلشن بن سکی — مجھ سے نہ بانی کے شاداں ہی نہ تھی

یہ کل بال ہے جب تب محو خواب — کو دو صحرا میں جولانی کے باب

میرا دریا لے اگر صحرا ہے تو — برق جلتے اگر سینا ہے تو

دے دیا ہے چشمۂ حیواں مجھے — زندگی کے راز مجھ کو مل گئے

دیکھا نہیں زاں ذرا کے سوز کا — ذرہ ذرہ جس سے جگنو بن گیا

نہ ہو کہتا ہوں کس سے کہے — کس نے یوں موتی پرو فکر کے

ہے یہ کس بیش بہا دل — کے بڑے ہیں آسماں

نہ ہو لہروں نے جھک کر دیے — ہیں چھا سکتا نہیں احباب سے

ساقیا اٹھ جام کو مینا سے بھر — کاوشِ ایام دل سے دور کر
آبِ زمزم سے کھنچی مے چاہیے — جو گدا کو ہمسرِ جم کر سکے
فکر جس سے ہو سکے ہشیار تر — دیدۂ بیدار ہو بیدار تر
اعتبارِ کوہ دے جو کاہ کو — شیر کی قوت دل روباہ کو
خاک کو اوجِ ثریا دے سکے — قطرے کو پہنائے دریا دے سکے
جس سے خاموشی میں شورِ حشر اٹھے — ٹپکے خون بازپائے کبک سے
لا مجھے ساقی شرابِ ناب دے — ظلمتِ اندیشہ کو مہتاب دے
سوئے منزل لے چلوں آوارہ کو — مضطرب کر دوں دلِ نظارہ کو
جستجوئے نو سے ہو کر گرم رو — روشناسِ آرزوئے نو بہ نو
بن سکوں میں نورِ چشمِ اہلِ ذوق — گوشِ عالم کے لیے آوازِ شوق
اور سخن کی قدر بالا کر سکوں (۱) — خشک سبزہ آنسوؤں سے تر کروں
پیش کرتا ہوں بہ فیضِ پیرِ روم — آشکارا کیے اسرارِ علوم
وہ گداز جاں کے ہیں سرمایہ دار — میں فروغِ یک نفس مثلِ شرار
شمع ہی پگھلی مرے پروانے پر — ما اشب خوں مے نے اس پیمانے پر
خاک کو اکسیر روئی نے کیا — سوزِ میری گرد کو وہ دے دیا
ذرۂ خاکِ دشت سے رخصت ہوا — تا کہ حاصل ہو شعاعِ مہر کا

اب میں اُن کے بحر کی اک موج ہوں سچا موتی تاکہ حاصل کر سکوں

ان کی صہبا سے ملی ہے سرخوشی

ہے انہیں کے دم سے یہ میری زندگی

رات یہ دل مائلِ فریاد تھا شورِ یا رب! سے سکوت آباد تھا

نغمۂ سنجِ سختی ایام تھا رو نا بس یہ تھا کہ خالی جام تھا

اتنا تڑپا ذوقِ نظارہ مرا بال و پر ٹوٹے تھکا اور سو گیا

خواب میں آیا وہ مردِ باخدا (۱) پہلوی میں جس نے قرآں ہے لکھا

بولا اے دیوانۂ اربابِ عشق چکھ لے تھوڑی سی شرابِ عشق

لے جگر پر شورشِ شر کا وار نیشتر پر آنکھ مت بیمار

مسکراہٹ کو رہین نالہ کر اشکِ خونیں سے جگر پر کالہ کر

غنچۂ سال کب تک رہیگا تو خموش پھول کے مانند ہو نکہت فروش

تجھ میں تو ہنگامہ ہے مثلِ سپند باندھ محمل آگ پر اے ارجمند

اور جب اس کی صورت تو بھی سربسر نالۂ خاموش کو آواز کر

گر ہے تو نے جہاں کو روشنی کر عطا دنیا کو اپنا سوز بھی

پیرِ میخانہ کے سب اسرار کہہ موجِ مے بن جا مہ مینا میں رہ

سنگ بن آئینۂ اندیشہ تو ہے ہاں عجب بازار میں شیشہ گر ہے

لا نیستاں سے پیام اب مثل نے (۱) اور برائے نفس اپنے نالے

نالہ کا انداز نو ایجاد کر ہاتھ دھو بیٹھے بزم کو آباد کر

جانِ تازہ کر عطا جو زندہ کو (۲) کہہ کے تم اب زندہ تر زندہ

اٹھ گئے بادے پہ ہمدمِ سفر ہم رہے سودائے جس کو دیدہ کر

آشنائے لذتِ گفتار ہو اے درائے کاروان بیدار ہو

میں یہ سن کر سخت دامن ہوا مثل نے ہنگامے سے بھر پور تھا

سازِ اپنے اشتیاق نو ہر گوش اک خلد کو ساز کیا

میں نے ظاہر کر دیا رازِ خودی

میں نے کھولا استعجازِ خودی

میرا نقشِ ہستی اک انکار تھا (۳) ناقبول و ناکس و ناکردہ

عشق کی سوبال سے میں آدم ہوا عالمِ کیف و کم عالم ہوا

حرکتِ اعصاب گردوں دیکھ کر چاند میں بھی گردشِ خوں دیکھ کر

راتوں انساں کے لیے رویا کیا زندگی کا راز آخر پا لیا

کھولا باب کارگاہِ ممکنات میں نے پایا رازِ تقویمِ حیات

مثل مہ اس شب میں سن آرا ہوں میں — ملتِ بیضا کی گرد پا ہوں میں
شہرۂ آفاق ملت ہے یہی — ہے دلوں کا سوز اس کی نغمگی
جس نے سورج ذرّے سے پیدا کیے — سینکڑوں علّار و رومی بھر لیے
آہِ دوزخ سوز فلک پر جاؤں گا — ہوں دھواں لیکن حقیقی آگ کا
فکر جولاں ہے قلم ہے تیز گام — رازِ نہ افلاک کھلتے ہیں تمام

یک قطرہ ہمسرِ دریا ہے
ارتقا سے ذرہ بھی صحرا ہے

اس سخن سے شاعری مقصد نہیں — بُت پرستی بُت گری مقصد نہیں
میں ہوں ہندی فارسی بیگانہ ہوں — ماہِ نو ہوں اور تہی پیمانہ ہوں
حسن اندر زبان مجھ سے نہ مانگ (۱) خوانسار و اصفہاں مجھ سے نہ مانگ
گرچہ شیریں ہیں ہندی ہے شکر — فارسی ہے اس سے شیریں بیش تر
فکر پرواز جب اس کا جادو چل گیا — کلک میرا شاخِ نخلِ طور تھا
فارسی، سن دین کی رفعت لیے — ہے مناسب میری طرزِ فکر کے

نکتہ چینی شکلِ مینا پر نہ کر
لطف صہبا سے اٹھا، اے دیدہ ور

(۲)

اصلِ نظامِ عالم خودی سے ہے اور تسلسلِ حیات
تعیّناتِ وجود کا انحصار استحکامِ خودی پر ہے

بس خودی کا کیا اثر ہے یہ شہود — اصلِ شے سرِّ خودی کی ہے نمود
جب خودی نے خود کو چونکایا ذرا — عالمِ پندار ظاہر کر دیا
سو جہاں پنہاں ہیں اسکی ذات میں — اسکی ضد ہے اس کے ہی اثبات میں
اس نے یہ طرزِ جدل ایجاد کی — خود کو بیٹھی ہے خود کہ اجنبی
غیر پیدا کر کے خود سے بار بار — یہ بڑھا لیتی ہے ذوقِ گیر و دار
خون پھر کرتی ہے خود اغیار کا — تاکہ اپنے زور سے ہو آشنا
خود فریبی اس کی عینِ زندگی — مثلِ گل خوں سے وضو کرتی ہوئی
روندتی ہے سو چمن گل کے لیے — برسوں روتی ہے کہ اک نغمہ ملے
اک فلک پر اس سے ہیں سو سو ہلال — کرتی ہے اک حرف پر صدہا مقال
وجہ اس بے دردی اور سفاکی؟ — "خلق و تکمیلِ جمالِ معنوی"
"حسنِ شیریں عذرِ دردِ کوہ کن" — نافہ مذرِ دامِ آہوئے ختن
سوزِ پیہم قسمتِ پروانہ ہے — شمع عذرِ محنتِ پروانہ ہے

سینۂ کبریا میں نشتر آہ نے اس سے بنائے
تاکہ گل کی صبح اس کے ہاتھ آئے

سینۂ ابراہیم اس کے شعاروں نے جلائے
تاکہ اک شمعِ فروزاں جگمگائے

ہوتی ہے یہ بہرِ افراسِ عمل
عامل و مشغول و اسباب و علل

خیزد و انگیزد و پرد و تابد و رمد ❊ سوزد و افروزد و کشد و میرد و زاید

اس کی جولاں گاہ ہے دشت و جبال
موجِ گرداب ہے اس کا اعتدال

ہے یہی گل کا رواں و جاں
جا گنہ اس کے دامن نہ رہا

اپنے صحرا کو نہ رہا بانگ کے
جز پرستی کے سبق اس نے دیئے

لوٹی خود اجرم بے سامان نے
کچھ ذرا بکھری تو یکساں بنائے

پھر بکھرنے سے ہوئی بیزار جب
ملنے جلنے سے ہوئی کہسار تب

خود کو ظاہر کرتی ہے ہر دم خودی
ذرّوں میں خوابیدہ قوت ہے یہی

قوت خاموش و بے تابِ عمل
ہے خرد سے دفتر اسبابِ عمل

جان عالم جب کہ ہے زورِ خودی
ہے بقدرِ استواری زندگی

قطرے نے سمجھا جہاں حربِ خودی
ہستیِ بے مایہ گوہر بن گئی

بڑھتی ہے۔ اٹھاتی ہے۔ اڑتی ہے۔ چمکتی ہے۔ دوڑتی ہے
جمتی ہے۔ جلاتی ہے۔ مارتی ہے۔ مرتی ہے۔ اگتی ہے (سانس لیتی ہے)

مے ہے بے پیکرِ خودی کے ضعف سے — اس کے پیکر پر ہیں احساں جام کے
پیکرِ ساغر نہیں گو مستعار — گردش اپنی ہم سے لیتا ہے ادھار
کوہ جب خود سے گیا صحرا ہوا — شکوہ سنجِ جوششِ دریا ہوا
موج ہے جب تک بھی ہم آغوشِ بحر — کرتی ہے خود کو سوارِ دوشِ بحر
آنکھ کی پتلی بنا جب گھر کے نور — جلووں کے پیچھے نظر پہنچی ضرور
سبزہ نے زورِ نمو جب لے لیا — فرشِ گلشن میں شگاف آنے لگا
شمع خود زنجیر جب اپنی بنی — ذرّوں سے وہ اپنی صورت پا گئی
جان اس کی خود گدازی سے گئی — اشک اپنی آنکھ کا بن کر بہی
گر نگیں فطرت میں ہوتا پختہ تر — اس کو کیوں ہوتا جراحت کا خطر
ہو گیا سرمایہ دارِ نامِ غیر — اب ہے وہ مجروحِ بارِ نامِ غیر
اپنی ہستی پر زمیں محکم ہے جب — گرد اس کے گھومتا ہے چاند سب
مہر محکم تر زمیں سے ہے مگر — یوں زمیں سورج کے ہے زیرِ اثر
دم بخود کر دیتی ہے شانِ چنار — اس کی سطوت ہے متاعِ کوہسار
اس کا پیراہن جو ہے آتش نژاد — ایک سرکش دانہ ہے اس کی نہاد

ساتھ ہو جب زیست کے زورِ خودی
بحر بن جاتی ہے جوئے زندگی

(۳)

حیاتِ نو، ذوقِ تخلیق، تولیدِ مقاصد سے ہے

مدّعا ہے بقائے زندگی — یہ ذرا ہے کردارِ زیست کی
زندگی بس جستجو ہے نہاں — اصل اس کی آرزو میں ہے نہاں
دل میں زندہ رکھ ہمیشہ آرزو — تاکہ تیرے جی سے مرنے تک نہ تو
آرزو ہے جانِ جہانِ رنگ و بو — ہے دلِ بے آرزو اک آرزو
رقص گاہِ دل اسی سے ہے — جلوے اس سے تابناک آئینے ہیں
بخشتی ہے خاک کو یہ بال و پر — موج اور کیا ہے یہ تموّج
دل میں جاں آتی ہے اس کے ہونے سے — غیر حق مرتا ہے جب یہ جی اٹھے
جب کہ تخلیقی تمنّا گم ہوئی — پر شکستہ دل سے پرواز اڑ گئی
آرزو ہے نور کش، افزائشِ خودی — گرم رو اک موجِ دریائے خودی
ہے اسی عبرت سے کی کمند — دفترِ نعمت کا ہے رازِ بند
زندگی آرزو سے مردہ ہے — شعلۂ نفس سرد سے افسردہ ہے
اصل کیا ہے دیدۂ بیدار کی؟ — ایک صورت لذّتِ دیدار کی
(معجزے ہیں شوخیِ رفتار کے — پاؤں کب ناتواں کو مل گئے
تھی یہ بجلی کی تمنّا جس نوا — حاصلِ مقدار جس سے وہ ہوا)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(۴)

خودی عشق و محبت کے حکم بالا ہے

نور کا نقطہ جسے کہتے ہیں خودی وہ ہماری خاک کی ہے زندگی

عشق سے ہے وہ پائندہ تر زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر

عشق سے ہے خودی کی پرورش انتہا اس کی ہے مشکل انتہا

آتش اندر لی فطرت عشق ہے عالم افلاک کی بنیاد عشق ہے

خود خدا عشق ہے ہم نہیں آپ کا اندازہ کا اس کی نہیں

عشق کی تقویم میں ہے عصر نو عصر آدم کا ہے عشق کا روز نو

ہوتے ہیں اس کی نظر سے کوہ و دشت حق کو بن جاتا ہے آخر عشق حق

عشق کی محراب میں ہے عصر نو چشم نوح و ایوب کا دل لے کے آ

خاک سے پیدا ہے بندے کی نہیں جا کسی کا آئے جا کر دل لگا

تجھ میں سوز جاں دوری ہے بجھ نہ جائے آتش تبریز سے

تیرا پیارا نہیں دل ہے جہاں تو اگر جانے تو تجھ پر عیاں

اس کے عاشق ہیں جو ہیں تیرے خاک اور رب ترا ذرہ جبیں

اس کی عظمت کی ترے بالا ہیں بنگ کو تیرے اوج آسماں

جس سے خاکِ نجد تیرا تنی ہوئی — وجد میں افلاک سے اونچی گئی
قلبِ مسلم ہے مقامِ مصطفیٰؐ — آبروئے مسلم کی نامِ مصطفیٰؐ
طور کیا ہے ان کے گھر کی خاکِ در — کعبے کا بیت الحرم ہے ان کا گھر
اور ابد اک پل ہے ان کے وقت کا — ہے انہیں کے دم سے اس کا ارتقا
بسترِ خوابِ جہاں کا تھا اک بوریا — تاجِ کسریٰ تو ہے ان کے خدمت کا
معتکف غارِ حرا میں جب رہے — قوم و آئین و علومِ مصطفیٰؐ
ان کی راتیں نیند سے عاری رہیں — تختِ جم پر سوئے تھے اکبر
دن میں ان کی تیغ تھی آہن گداز — آنکھ نم رہتی تھی دورانِ نماز
فتح پیکر ناصرِ دیں ان کی تیغ — قاطعِ نسلِ سلاطیں ان کی تیغ
اک نیا آئین دنیا کو دیا — اقتدارِ اقوامِ پیشیں سے لیا
کام دنیا کا بنایا دین سے — غیر ممکن کوئی ان جیسا ملے
اور تخت ان کی نظر میں تھی حرام — کھانا ان کے ساتھ کھاتے تھے غلام
سامنے آئی جو بعدِ دار و گیر — دخترِ سردار طے ہو کر اسیر
پاؤں میں زنجیر تھی بے پردہ تھی — شرم سے سمٹی ہوئی افسردہ تھی
آپ نے دیکھی جو یہ بے پردگی — اپنی چادر اس کے سر پہ ڈال دی

ہم تو عریاں نہیں ہیں خانوں سے — پیشِ اقدار جہاں ہیں سر کھلے
حشر میں ان پہ ہے اپنا انحصار — اس جہاں میں بھی وہی ہیں پردہ دار
ان کا لطف و قہر رحمت جانیے — دوست پردہ اور یہ دشمن کے لیے
مکّے میں یہ رحم اعدا پر کیا (۱) — دے دیا پیغام "لا تثریب" کا
ہم کہ ہیں قیدِ وطن سے ایسے دور — اک نظر میں جیسے دو آنکھوں کا نور
اہلِ ایراں نہ حجازی نہ اہلِ چیں — شبنمِ یک صبحِ خنداں ہیں ہمیں
مست چشمِ ساقیِ بطحا ہیں آپ — دہر میں مینا لیے پینا ہیں ہم
ان کے دزدوں نے دنیا پاک کی — انبیا ذاتِ نسب کو آگ دی
ایک بوئے گلِ سوریہ کی — ہم کبھی خوشبو رکھتے ہیں بس ایک ہی
جب کہیں ہم ہیں اور جہاں بھی ہو قیام — ایک ہیں وہ۔ ان کے ہو اپنا نظام
ان کے دل کا راز تھے گویا ہمیں — ان کے نغمے سے ہوئے افشا ہیں
ان کی دھن ہو اس نے خاموش ہیں — نغمے بیکل ہیں مری آغوش میں
کیا کہیں ان کی نوا کے لیے (۲) — روتی ہے اب خنک ان کے ہونٹ کے
جب کی مسلم ہے ان کی جلوہ گاہ — خالقِ صحرا ان کی گردِ راہ
جنگ کو ہیبت ان کے آئینے نے دی — نور سے ان کے سحر میری ہوئی

ہے تپش میرے لیے راحت مدام — گرم تر ہے صبحِ محشر سے یہ شام
ہیں ہوں ان کا باغ و ابرِ بہار — میرے تاکستاں کے وہ ہیں آبیار
کشتِ اُلفت ہیں تب آنکھیں کاشت کیں — دید کی تب لذتیں مجھ کو ملیں
خاکِ یثرب ہیں دو عالم کا ہے نور — اے سلامت شہرِ حب ہیں ہیں حضورؐ
ہیں شہیدِ طرزِ جامی ہو چکا — نقص یہ اقوال سے ان کے مٹا
کیا کہا ہے شعرا نحوی نے پُر اثر — مدحِ مولا میں پڑھے ہیں گہر

نسخۂ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست [۱]

کیفیت انگیز ہے مے عشق کی — عشق کا اک نام ہے تقلیبِ یار
اس میں بستائی تھے اتنے کامیاب [۲] — کہتے تھے خرابات مے دہ اجتناب
ہے اگر عاشق تو کر تقلیبِ یار — تاکہ ہوں تیری کمند میں حق شکار
دل کی خلوت میں پہنچ اے دیدہ ور — ترکِ خود کر سوئے حق ہمت تو کر
ہو کے محکم حق سے خود کی سمت چل — اور ہوس کے توڑ دے آلات و بل
کر مہیا شکرِ سلطانِ عشق — جلوہ گر ہو جا سرِ فاران عشق

تاکہ رب کعبہ تجھ کو اوج دے
شرح اِنّی جاعِلٌ کر دے تجھے [۳]

(۵)

خودی سوال سے ضعیف ہوتی ہے

اے کہ تو لیتا تھا شیروں سے خراج — بن گیا بزدل بوجہِ احتیاج

خستہ اب یوں ہے کہ تو نادار ہے — تیرے دُکھ کی جڑ یہی آزار ہے

ہے یہی بس ہنرِ فکرِ بلند — کر کے گل شمعِ خیالِ ارجمند

ہاں خمِ ہستی سے مے کا جام لے — اپنا حق لے کیسۂ ایام سے

اونٹ سے نیچے از مثلِ عمرؓ — غیر کی منت سے سو بار الحذر

سائلِ منصب رہے گا تا بہ کے — مثلِ طفلاں ہے سوارِ اسپ نے

ہے نظر جس کی فرازِ چرخ پر — کرتا ہے پست اس کو احسانِ گر

بھیک سے ہوتی ہے عزت خوار تر — اور گدائی سے گدا نادار تر

"نشتر اس سے ہے جدا اجزائے خودی — "بے تجلی نخلِ سینائے خودی"

اپنی مٹی منتِ سیل نے نہ دے — مثلِ مہ خود ہی سے اپنا رزق لے

تو جو بدبختی کے ہو گرداب میں — سازِ ساماں ہو ترا سیلاب میں

نعمتِ دیگر سے رزق اپنا نہ مانگ — چشمۂ خاور سے اک چھینٹا نہ مانگ

تا کہ محشر میں خجالت سے بچے — آئے جب اپنے نبی کے سامنے

چاند کی روزی ہے خوانِ مہر سے — دیکھ اس کے دل پہ داغِ احسان کے
حق کی ہمّت پر فلک کہ آزما — سر نہ جھکنے پائے تیری قوم کا
جو بتوں سے پاک کعبہ کر گئے — "مردِ کاسب" حق کا پیارا کہہ چکے
وائے وہ منّت پذیرِ خوانِ غیر — جس کی گردن خم کرے احسانِ غیر
جلتا ہو جو برقِ لطفِ غیر سے — کوڑیوں میں رکھ دے غیرت بیچ کے
اس پریشاں تشنہ لب پر آفریں — خضر سے اک جام جو لیتا نہیں
اس کے رخ پر خجلتِ سائل نہیں — آدمی وہ صرف مشتِ گل نہیں
زیرِ گردوں بس وہی اک ارجمند — چلتا ہے مثلِ صنوبر سر بلند
مفلسی میں جو رہے خوددار تر — بخت سے اے اور وہ ہو بیدار تر
بھیک کا دریا ہے سیلِ شعلہ بار — اپنی محنت کی ہے شبنم پر بہار

یوں حباب آسا دمِ مردانہ رکھ
بحر کے اندر نگوں پیمانہ رکھ

(۶)

جب خودی عشق و محبّت سے محکم ہو جاتی ہے تو نظامِ عالم کی تمام ظاہر و پنہاں قوتوں کو مسخر کر لیتی ہے

جب کہ محکم ہو محبّت سے خودی — غنی ہے فرماں روا عالم وہی

نقش [illegible] بنائے پرستانے — غنچۂ چمن کرب خودی کی شاخ سے
ہاتھ بن جاتا ہے اس کا دست حق — اک اشارے سے قمر ہوتا ہے شق
عالمی جھگڑوں میں وہ بن کر حکم — ہوتی ہے فرماں دہِ دارا و جم
تجھ سے کہتا ہوں حدیث اولیٰ — ان سے ہیں ان ملک میں ذوق سجم
"اک نوا پیرائے گلزارِ کہن — گفت با از گلِ رعنا سخن"
اک دیارِ [illegible] — ان کے دامن کی نمک سے پشت
کوچک ابدال ان کا [illegible] — مست جام بوعلی تھا سر بسر
حالِ شہر [illegible] — ساتھ تھے اس کے غلام و چوبدار
بڑھ کے جھک [illegible] — راہِ بحرِ حال سے [illegible]
غرقِ فکر از [illegible] — سر جھکائے راہ پر چلتا رہا
چوبدار [illegible] — لاٹھیاں ماریں سرِ درویش پر
[illegible] لیکن فقیر [illegible] — دل شکستہ ناخوش و افسردہ تھا
اک [illegible] — اس قدر روایا کہ [illegible]
جس [illegible] — ہاں اٹھے شعلے آگ برسانے لگے
اک [illegible] رگِ جاں سے اٹھا — میر منشی سے یہ فرمایا کہ

لکھا ابھی فوراً قلم سے کام لے — شاہ کا فرمان میرا بھیج دے
ظلم خود پر تیرے عامل نے کیا — میرے دیوانے کو زخمی کر دیا
برطرف کر عامل بد ذات کو — ورنہ میرے حکم سے معزول ہو
اس خدا والے کا یہ خط جب ملا — خوف سے سلطان تھرّانے لگا
سر بسر اک پیکرِ آلام تھا — زرد مثلِ آفتابِ شام تھا
طوق ڈالا عاملِ مغرور کے — عفو چاہا بوعلیؒ درویش سے
خسروِ شیریں سخن رنگیں بیاں — جن کے نغموں میں روحِ کن فکاں
شاعرِ پُرفن ضمیر و با ادب — ہو گئے بہرِ سفارت منتخب
جنگ اُن سے چھیڑا پیشِ بوعلیؒ — سوزشِ جانِ قلندر بڑھ گئی
شان وہ جو نازشِ کہسار تھی — قیمتِ یک نغمۂ گفتار تھی

دل پہ درویشوں کے نشتر مت چلا
آتشِ سوزاں میں خود کو مت جلا

---

(۷)

حکایت

اس معنی میں کہ مسئلۂ نفیِ خودی مغلوب قوموں کی اختراع ہے جو اس مخفی طریقے سے غالب قوموں کے اخلاق کو کمزور بنا دیتی ہیں

یہ پرانی داستاں بھی ہے سُنی
بھیڑیں اک میدان میں تھیں کنی

گھاس اور آفریں کے نسل افزا ہوئیں
دشمنوں کے خوف سے آزاد تھیں

ثروتِ قسمت سے آخر ایک بار
ہو گیا تیرِ قضا سینے کے پار

شیرِ جنگل کی ہلاکت سے گئے
اُس چراگہ پر وہی قبضہ پا گئے

جذبۂ استیلا ہے قوت کا شعار
فتح ہے قوت کا رازِ آشکار

بھیڑیوں شاہی تیرِ دل نے بجھا دیا
بھیڑوں کو سرِ دم آزادی کیا

کام ہی شیروں کا ہے سیر و شکار
بھیڑیوں کے خوں سے رنگا وہ مرغزار

بھیڑ اک پالاک تھی فہمیدہ تھی
کہنہ سال اور گرگِ باراں دیدہ تھی

قوم کے حالات تھی دل فگار
شیروں کے جورِ ستم کی تھی شکار

ثروتِ قسمت کے گر شکوے کیے
نام اپنے کر لیے "مذبیرے"

ناتواں اپنی حفاظت کے لیے — عقل سے لاتا ہے حیلے مانگ کے
اور غلامی میں پئے دفعِ ضرر — ہوتی ہے تدبیر اکثر تیز تر
پختہ جب ہو لے جنونِ انتقام — فتنہ جوئی کرتی ہے عقلِ غلام
اس نے سوچا عقدہ ہے مشکل ضرور — اپنا بحرِ غم ہے بے ساحل ضرور
زور کر کے شیر سے چھٹتے نہیں — دستِ آہن میں پڑے پنجہ آہنیں
یہ بھی ناممکن کہ سنکر وعظ و پند — خوئے گرگی سیکھ لیں یہ گوسفند
شیروں کو بزدل بنانا سہل ہے — ہاں نہیں غافل بنانا سہل ہے
صاحبِ الہام بس وہ ہو گئی — کچھ سمجھ کر شیر دل کی واعظی
اور کہا اے قومِ کذابِ اشر[1] — یومِ نحسِ سمرے سے بے خبر
مایہ دارِ قوتِ ایماں ہوں میں — بہرِ شیراں مرسلِ یزداں ہوں میں
دیدۂ بے نور کا میں نور ہوں — صاحبِ دستور ہوں مامور ہوں
چھوڑ دو اعمالِ نامحمود کو — نفع کی سوچو ضرر کے دو سنو
جو قوی اور تندرست ہے وہ ہے شقی — زندگی کا زور ہے نفیِ خودی
گھاس ہی بس نیک بندوں کی غذا — گوشت کا تارک ہے مردِ باخدا
تیزیِ دنداں سے تم رسوا ہوئے — عقل کے اندھے اسی سے ہو گئے

ہے نہیں کچھ فائدہ بربادیاں — فائدہ کچھ زر و دولت سے ہیں

جستجوئے عظمت و سطوت بری — تنگ دستی ہے امیری سے بھلی

برق دشمن کب ہے دانے کی کہیں — دانہ جو خرمن بنے عاقل نہیں

کیوں نہ صحرا اک ذرہ بنے — تاکہ سورج سے لپک لو لو کہ

مار کر بھیڑیں جو تم کرتے ہو ناز — ذبح کر کے خود کو ہو لے سرفراز

زندگی کو کرتا ہے ناپائیدار — "جبر و قہر و انتقام و انتشار"

سبزہ و آب و ہوا کا ہے ربا — خواب مرگ آنکھوں سے وہ دھوتا رہا

خود کو بھولو تم اگر فرزانے ہو — خود سے گر غافل نہیں دیوانے ہو

آنکھیں لب اور کان کر لو خوب بند — تاکہ تم کو مل سکے فکر بلند

یہ چراگاہ جہاں ہے چیز کیا — دل نہ اس موہوم پہ آئے ذرا

سخت کوشی سے تھکے تھے یہ سب — تن پرستی کی طرف مائل تھے اب

یہ تماشا دغدغہ ان کو جگا گیا — بس حماقت سے یہ دھوکا کھا لیا

وہ تنگاری تھے جو اب تک بھڑکے — گو سفندی دین پر عامل ہوئے

سبزہ آخر ان کے منہ کو لگ گیا — گو ہر شیری خزف میں کر رہا

کھا کے دنبہ کی دنبال گئی — آنکھ کی ہیبت جو تھی جاتی رہی

رفتہ رفتہ دل بھی نکلا سینے سے
تابِ جوہر گم ہوئی آئینے سے

وہ جنونِ کوششِ کامل گیا
وہ تقاضائے عمل اور دل گیا

گم ہوا وہ عزم و استقلال بھی
اعتبار و عزت و اقبال بھی

آہنیں پنجے بھی بے جاں ہو گئے
مر گئے دل، تن مزاراں کے بنے

خوفِ جاں بڑھنے لگا قوت گئی
موت سے گھبرائے تو ہمت گئی

سوزِ من دے کر گئی بے ہمتی
"کہ نہ دستی، بے دلی، دوں فطرتی"

شیر بیدار اس فسوں سے سو گیا
اس نے تہذیب اپنی پستی کو کہا

---

(۸)

افلاطونِ یونانی جس کے تصوّرات سے تصوف اور ادبیاتِ اسلامیہ بہت متاثر ہوئے، مسلکِ گوسفندی پر عامل تھا اس کے تخیّلات سے دُور رہنا واجب ہے (*)

پیرِ خلوت گہِ افلاطوں حکیم — سرگروہِ گوسفندانِ قدیم
ظلمتِ معقول میں جو کھو گیا — وادیِ موجود میں لغزیدہ تھا
تھا اسیرِ اس درجہ نامحسوس کا — اعتبارِ چشم و گوش اس کو نہ تھا
موت کو اس نے بتایا زندگی — شمع کے بجھنے میں دیکھی روشنی
وہ تخیّل پر ہمارے ہے سوار — اس کی مے سے اونگھتے ہیں ہوشیار

(*) افسوس ہے کہ اس مسئلے کی توضیح اس جگہ ناممکن ہے۔ فارابی نے "الجمع بین الرائین" میں ارسطو اور افلاطون کو ہم خیال ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو میرے نزدیک ناکام رہی ہے۔ ملّا ہادی سبزواری نے جو حال کے ایرانی حکما میں سے ہیں اپنی کتاب اسرار الحکم میں زیادہ تر افلاطون کا تتبع کیا ہے۔ عربی اور فارسی جاننے والے ناظرین ان کتب کی طرف توجہ کریں۔ انگریزی دانوں کو فلسفۂ مغرب کی کسی انگریزی تاریخ سے ان مسائل کی حقیقت مختصر طور پر معلوم ہو جائے گی۔ (اقبال)

یہ نوٹ مسئلہ عیان کے سلسلے میں درج ہوا ہے لیکن چونکہ اس باب کے عنوان کی اساس بھی یہی مسئلہ ہے اس لیے یہاں درج کر دیا گیا ہے۔

گو سفینہ اک شکلِ آدم میں وہ تھا
سو فیلوں پر حکم اس کا چل گیا

خود کو سمجھا رازدارِ آسماں
عالمِ اسباب کو وہم و گماں

کرتا تھا تحلیلِ اجزائے حیات
کاٹی شاخِ سرو رعنائے حیات

وہ زباں کو سود ہی کہتا رہا
بود کو نابود ہی کہتا رہا

اونگھتی فطرت نے ڈھالا ایک خواب
اس کی چشمِ ہوش سے نکلا سراب

چونکہ ذوقِ جہد سے محروم تھا
اس لیے وارفتۂ معدوم تھا

منکرِ ہنگامۂ موجود تھا
خالقِ اعیانِ نامشہود تھا

زندہ جاں کو عالمِ امکاں ہے خوب
مردہ جاں کو عالمِ اعیاں ہے خوب

اس کو آہو جانے کیا لطفِ خرام
کبک پر اس کے ہوا چلنا حرام

اس کی شبنم میں نہیں ہے تابِ رم
اس کے طائر میں نہیں اڑنے کا دم

اس کے دانے میں نہیں اگنے کا ذوق
اور نہ پروانے کو ہے جلنے کا شوق

کرتا کیا راہب ہمارا بھاگ اٹھا
اس جہاں کی شورشوں سے ڈر گیا

شعلۂ افسردہ سے کرتا تھا پیار
وہ تھا انیقی جہاں کا دستکار

سوئے گردوں وہ نشیمن سے گیا
پھر نہ اپنے آشیاں تک آ سکا

ہے خیال اس کا خمِ گردوں میں گم
کیا کہوں یہ دردِ ہے یا خشتِ خم

[illegible]

(۹)

[illegible] اردو شاعری

آرزو [illegible] آرزو [illegible] شعر

[illegible] ایک بہت بڑا جلال بھی ہے

[illegible] آرزو [illegible] تسخیر کا

[illegible] حسن و الفت کا پیام آرزو

[illegible] اس نوائے زندگی میں زیر و بم

[illegible] سوز و [illegible] بے دلیل

[illegible] تیرے دل کو دیتا ہے وہ آرزو

[illegible] ہے ذہن پروردگارِ آرزو

[illegible] مطلع انوارِ حسن

[illegible] اس کے کرے محبوب تر

[illegible] اس نوائے رنگ و بو

آرزو کا سوز ہے پروانوں میں — رنگ اسی کا عشق کے افسانوں میں
بحر و بر سب اس کے آبِ گِل میں ہیں — سو جہاں پوشیدہ اس کے دل میں ہیں
نادر و بیدہ لالے اس کے ذہن میں — نامشنیدہ نغمے نالے ذہن میں
فکر اس کا نجم و مہ کا ہم نشیں — بدرے نادا قف ہے وہ خوب آفریں
خضر ہے اور حاملِ آبِ حیات — جس کے آنسو ہیں جواں ہر کائنات
ہم گراں سیر اور خام و سادہ ہیں — راہِ منزل ہی میں پا افتادہ ہیں
بلبل اس کا اس لیے ہے نغمہ ریز — چال سے اس کی نہ ہو ہم کو گریز
اور چلیں ہم سوئے فردوسِ حیات — حلقۂ کامل بنے قوسِ حیات
کارواں اس کی درا پر گامزن — ہو رہے ہیں اس کی نوا پر گام زن
اور ہمارے باغ میں اس کی نسیم — آ کے بن جاتی ہے پھولوں کی شمیم
اس کے جلووں سے خود افزا زیست ہے — خود حسابِ ناشکیبا زیست ہے

دعوتِ فیض اس سے پاتے ہیں سبھی
سوز اپنا عام کرتا ہے وہی

وائے وہ اک قوم اجل سے بہرہ مند — جس کے شاعر کو نہ ہو جینا پسند
بد ہو جس کے آئینے میں خوش نگار — نہ ہو جس کا ہو جگر کے آر پار

بوسہ جس سے چھینے گُل کی تازگی — اور بلبل سے لگن پرواز کی
جس کی افیون سے ہے تجھ میں مُردنی — جس کے مضموں کی ہے قیمت زندگی
چین لے جو خوبیِ سروِ چمن — باز سیکھے جس سے تیری چلن
نیم جاں ہی نیم انساں ایک شے (۱) — وہ کہ مانندِ بناتُ البحر ہے
ناخدا پر کر کے جادوئے نوا — غرق کرتا ہے سفینے بارہا
اُس کے ان نغموں سے پا کر بے حسی — موت میں تو دیکھتا ہے زندگی
خواہشِ ہستی بہر دم چھین کر — چھینتا ہے تجھ سے وہ تیرا ہُنر
دیتا ہے طرزِ زیاں ہر سُود کو — کرتا ہے مذموم ہر محمود کو
بخش کر اندیشے تجھ کو بے محل — چھین لیتا ہے ترا ذوقِ عمل
وہ مریض اس کے سخن سے ہم ہیں زرد — اس کے دورِ جام سے محفل ہے سرد
اس کے نیساں میں نہیں بجلی کی تاب — اس کا گلشن رنگ اور بو سے خراب
حُسن کو اس کے ہے سچائی سے عار — اس کے دریا میں ہیں گوہر عیب دار
جاگ کے کیسے نہ ہو کاوش پسند — اس کے دم سے سوزِ دل تجھ سے بند

---

(۱) یہاں آدھا بنتِ انجال تعبیر انگریزی میں سائرن کہتے ہیں ملاحوں کے توہم کے رو سے ان کا آدھا جسم مچھلی کا ہوتا ہے اور آدھا انسان کا۔ یہ راز داں انکی خوش آوازی سے گمراہ ہو کر غرق ہو جاتے ہیں

زہر آمیز اس کی بانگِ نغمہ بار ناگنیں بن کر اس سے چھولیں ہزار

اس کی مینا سے حذر اے جرعہ نوش

الحذر اس کی مئے گل فام سے

اے کہ تجھ میں لغزشِ پا آ گئی وہ صبوحی اس کی مینا سے ملی

اس کے نغموں سے ترا دل بجھ گیا زہرِ قاتل تو نے کانوں سے پیا

ہے عیاں پستی ترے انداز سے بے نوا ہیں تار تیرے ساز کے

تجھ کو تن آسانیوں سے کام ہے ننگِ اسلام آج تیرا نام ہے

باندھ سکتے ہیں رگِ گل سے تجھے خستہ ہو سکتا ہے بادِ صبح سے

عشق رسوا ہے تری فریاد سے بگڑا نقش اس کا ترے بہزاد سے

تیرے دکھ سے اس کا چہرہ زرد ہے اس کی گردن تیرے دم سے سرد ہے

خستہ جاں ہے خستہ جانی سے تری ناتواں ہے ناتوانی سے تری

گریۂ طفلانہ کا خوگر ہوا آہوں سے بھر پور اس کا گھر ہوا!

بھیک میں ہے مست وہ متوالوں کی تاکتا ہے کھڑکیاں کاشانوں کی

ناخوش و افسردہ و آزردہ ہے پٹ چکا دربار سے اب مردہ ہے

غم سے مثلِ بید تھرانے لگا آسماں کے شکوے لب پر لا چکا

وصف اس کا ابتدا ل و کینہ ہے ضعف اس کا ہمدم دیرینہ ہے

پست ہے کم بخت وہ اور بدنہاد ناسزا مایوس اور ہے نامراد

جان تیری اس کے نالوں سے گئی نیند ہمسایہ کی بھی اُڑ کر رہی

وائے سوزِ دل جو یوں ٹھنڈا ہوا

ابتدا حق جس کی، باطل انتہا

بیت میں نقدِ سخن ہے کچھ اگر زیست کی قدروں سے اسکی جانچ کر

فکرِ بیت ہے عمل کی راہ پر برق ہو جیسے گرجے پیشتر

فکرِ نایاب اور زیبا دب درکار ہے رجعت اب عہدِ عرب درکار ہے

ہوں عرب کے حسن سے راز و نیاز (۱) چمکے شامِ اگر دے بزمِ حجاز

---

(۱) [illegible] اصلاحات کو [illegible] نے
[illegible] کی عینیت سے) کی [illegible]

(اقبال اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں)

کہا جاتا ہے کہ ایک بار کرد جنہ طالب علموں کے پاس گیا اور ان سے تصوف کے اسرار و رموز سمجھنے کی درخواست کی انھوں نے کہا چھت سے رسی باندھ کر الٹے لٹک جاؤ اور لٹکے لٹکے جب تک [illegible] رہو تو ہم [illegible] بتائیں گے۔ سادہ لوح کرد نے ایسا ہی کیا۔ اللہ [illegible] اسرار [illegible] بن [illegible] اور [illegible] کے [illegible] کیا کرتا تھا کہ شاہ کو توہین کرنی تھی لیکن اگلی صبح جب [illegible] اٹھا [illegible] — [illegible] عراق اور ایران سے ملحق علاقہ

گُل گلستانِ عجم سے چُن لیے
نو بہارِ ہند و ایراں دیکھ کے

گرمیِ صحرا سے اب کچھ لطف لے
دورِ جامِ بادۂ خُنکا پلے

سر چھپا اب اس کی گرمِ آغوش میں
تن کو اس کی لُوں کے جھونکے بھی ملیں

تُو نوا پرستیم ہیں تو غلطاں رہا
گھر درے کھدر کا عادی ہو ذرا

رقص تیرا فرشِ گُل پر ہو چکا
مثلِ گُل شبنم سے منہ بھی دھو چکا

ریگِ سوزاں پر ذرا خود کو لٹا
چشمۂ زمزم میں بھی غوطہ لگا

مثلِ بلبل ذوقِ شیون تا بہ کے
گلستانوں میں نشیمن تا بہ کے

اے ہما سایہ میں تیرے ارجمند
آشیانہ ہو سرِ کوہِ بلند

آشیاں ہمسایہ برق و رعد کا
مسکنِ شہباز سے اونچا بنا

تا کہ ہو شایانِ پیکارِ حیات
تجھ کو گر پائے ذرا نارِ حیات

---

(۱۰)

تربیت خودی کے تین مرحلے ہیں پہلے کا نام اطاعت دوسرے کا ضبطِ نفس اور تیسرے مرحلے کا نام نیابتِ الٰہی ہے۔

مرحلۂ اوّل اطاعت

خودی و محنت و فقر است شتر بار سفر — ہمرہ ایں قافلہ ہا را بہ کوہسار

چلتا ہے جس راہ کم خوں ہیں ذرا — کارواں کی ناؤ ہے صحرا میں وہ

اس کا نقش پا نصیب ناقہ ہے — کم خور و کم خواب و محنت مست ہے

مست زیرِ بارِ محمل راہ میں — پا بہ جولاں سوئے منزل راہ میں

سرخوش اپنی مستی رفتار سے — صبر آموز اپنے راکب کے لیے

فرض ادا کر تو بھی اور ہو کامیاب (۱) لے فیض عہدۂ حسن الثواب

بن اطاعت کوش اے غفلت شعار — جبر سے ہوتا ہے پیدا اختیار

اک اطاعت ہی سے ناکس کس بنے — دیکھ شعلے سرکشی کے خس بنے

کرتا ہے تسخیر جو افلاک کی — ہے کسی آئین کا پابند بھی

گل کے زنداں میں ہوا خوشبو بنی — قید سے بو نانک آہو بنی

رکھتے ہیں تارے سوئے منزل قدم — سرِ کسی آئیں کے نہ گئے کر کے خم
سبزہ اُگتا ہے نمو کے دین پر — ہوتا ہے پامال اس کو چھوڑ کر
سوزِ پیہم لالہ کا قانون ہے — جس کے باعث اس میں لالی خون ہے
قطرے دریا، وصل کے آئین سے — ذرّے صحرا، وصل کے آئین سے
باطنِ ہر شے کی قوت ہے یہی — تو نے اس کو چھوڑ کر کیوں راہ لی
آج اے آزادِ دستورِ قدیم — بس بس سے پھر وہی زنجیرِ بیم
سختیِ آئیں کے قصے مت سنا
خود پہ قائم رکھ حدودِ مصطفیٰؐ

مرحلۂ دوم ضبطِ نفس

نفس تیرا اک شتر ہے خود پرست — خود سر و خود رائے اور اپنے میں مست
مرد بن ہاتھوں میں اس کی باگ لے — تاکہ ریزہ ہے تو موتی بن کے
جو کہ خود پر بھی نہ قابو پا سکا — ہو گیا پابندِ حکمِ غیر کا
خاک سے تعمیر جب تیری ہوئی — ڈر کے ساتھ الفت بھی کچھ گوندھی گئی
ڈر جہاں کا، آخرت کا، جاں کا خوف — خوفِ عرش و فرش بن و آں کا خوف
بیم و ذر سے عشق اور حبِ وطن — رشتہ داروں کی محبت حبِ زن

اب وہ کی نفس سے تن پروری — کشتۂ فقر و شکر ہے یہی

رکھتا ہے لرزہ عالمِ لا الٰہ — ہر ملحد خوف تو اور کرتا ہے

حق ہی جب کے جسم کی جاں ہو گیا — سر نہ اس کا پیشِ باطل جھک سکا

ہو گیا دل اس کا بے پروا اس — رعبِ غیر اللہ نہ آیا اس کے پاس

جو حدود اللہ پر جس گیا — بیڑی کی زنجیر بندش سے چھٹا

پاسوی سے کر کے قطع نظر (۱) رکھتا ہے خنجر پہ کے جا پر

وہ اکیلا بھی ہے شامل اک فوج کے — جاں گراں ہوتی نہیں اس کے لیے

لا الٰہ کے بعد ہوتی نماز — پنجگانہ ہے مسلماں کی نماز

ہاتھ میں مسلم کے خنجر ہے یہی (۲) قاتلِ فحشار و منکر ہے یہی

روزہ کہتا ہے فتح جوک اور بیاتی — نیت تن پروری کا توڑ کر

نورِ فطرت ہے مومن کے لیے — جس سے ہجرت کے لیے اس کو ملے

ہے اطاعت ہی سے جمعیت تری — ناظمِ افرادِ ملت ہے یہی

اور زکوٰۃ مسلمان دولت کی فنا — کرتی ہے ہم کو مساوات آشنا

دل جہاد فی سبیل اللہ (۳) حسبِ زکوٰۃ کردہ ہوتا ہے غنی

ان سے ہی ہے تیرا استحکام ہے — تیری قوت ہے ترا اسلام ہے

یا قوی کے زور سے ہو جاتی
ہو سوار اشترِ خاکی ابھی

مرحلۂ سوم نیابتِ الٰہی

گر شتر باں ہے جہاں باں بھی ہے تو — مالکِ تاجِ سلیماں بھی ہے تو
ہے جہاں اجبہ تک جہاں آرا ہے تو (۱) — تاج دارِ ملکِ لَا یَبْقٰی ہے تو
دہر میں حق کی نیابت کر پسند — اور عناصر پر حکومت کر پسند
نائبِ حق کیا ہے؟ جانِ کائنات — اسمِ اعظم کا ہے سایہ اس کی ذات
جزو و کل کے راز سے آگاہ ہو — جو یہاں قائم بامرِ اللہ ہو
جب نہ جبہ جانبِ عالم کرے — اس بساطِ کہنہ کو برہم کرے
فطرتِ معمور سے بے تاب ہو — اک نئے عالم کو جو بخشے وجود
سوجھ اس مشعل جہانِ جزو و کل — ذہن سے اس کے اگیں مانندِ گل
پختہ کر کے فطرتِ ہر خام کو — کعبے سے باہر کرے اصنام کو
زخمہ اس کا تارِ دل پر نغمہ زا — بہرِ حق ہو اس کا سونا جاگنا
جس سے ہو پیری میں آہنگِ شباب — بخش دے ہر چیز کو رنگِ شباب

وہ بشیر اور نذیر [illegible] خود سپاہی خود سپہ گر خود امیر
[illegible] ہے [illegible] ہے

بات میں رکھتا ہے وہ [illegible] نور حق کا اس سے روشن [illegible]

پاک اٹھا یہ بے جب وہ فہم و آ — تیز ہوتا ہے تمنا روزگار
خشک کر کے دبدبے سے نیل کو — مصر سے لاتا ہے سیل کو

مردہ روحیں [illegible] زندہ ہو جاتی ہیں اس کے فکر سے
وجہ فرات [illegible] اور [illegible] جلال

[illegible] — [illegible] کا
[illegible] کا [illegible]

[illegible] — شعر اس کی [illegible]

[illegible] — دیکھیں گے اس [illegible]
[illegible] — [illegible]

بس ہمارا غنچہ ہے گلشن لیے — آنکھ یہ روشن ہے کل کے نور سے

اے سوارِ اشہبِ دوراں ابھی آ — اے فروغِ دیدۂ امکاں ابھی آ

رونقِ ہنگامۂ ایجاد ہو — آ، ہماری آنکھوں میں آباد ہو

شورشِ اقوام کو خاموش کر — نغمہ اپنا اب بہشتِ گوش کر

اٹھ کے قانونِ اخوت ساز دے — پھر ہمیں صہبائے الفت چاہیے

پھر جہاں کو بخش دے ایامِ صلح — جنگ بازوں کو سنا پیغامِ صلح

نوعِ انساں کشت اور حاصل ہے تو — کاروانِ زیست کی منزل ہے تو

گر گئے جورِ خزاں سے برگ و بار — آ ہمارے باغ میں مثلِ بہار

دیکھ لے طفل و جوان و پیر سب — شرمساری سے ہیں سجدہ ریز اب

تیری ہستی سے جو ہم ہیں سرفراز
سوز اس دنیا کا ہے اپنا گداز

شرحِ اسرارِ اسمائے علی مرتضیٰؓ (۱)

مادۂ اوّل شہِ مرداں علیؓ — عشق کا سرمایۂ ایماں علیؓ

ان کے کنبے کی ولا سے زندہ ہیں — دہر میں مثلِ گہر تابندہ ہیں

مثلِ نرگس ہر نظر کی لگی — بوئے آوارہ ہیں اُن کے باغ کی

ان کے خاکِ پا ہیں ہر دم کا چشش — میرے انگارے ان کے دم سے سبز و خوش

اُن کی نعت سے آئینہ ہے میری خاک — دیکھ میرے سینے میں نغماتِ پاک

ان کے شہ سے ہی نبی نے فال لی — شانِ شوکت ان سے ملّت کو ملی

نعت دینِ مبیں ہے ان کی بات — ان کے کنبے سے ہے نظمِ کائنات

نام ایزد نے رکھا بوترابؓ — اور یداللہ کہتی ہے اُمّ الکتاب

جو ہے دانائے رموزِ زندگی — جانتا ہے سرِّ اسمائے علیؓ

نفس ہے جن کا نام وہ بے نورِ خاک — عقل جس کے ظلم سے ہے سینہ چاک

بہت جس سے فکرِ عالی ہو گئی — کان بہرے آنکھ نابینا ہوئی

ہے نفس ہو یا نفس لے ہوئے — راہی اس رہزن پر آخر مر مٹے

شہِ حق نے خاک پہ تسخیر کی — یہ گلِ تاریک بھی اکسیر کی

حق میں ان کی تیغ سے ہے آبِ تاب — فتح ملکِ تن سے وہ ہیں بے تراب

مردِ کشور گیر کرّاری سے ہے — آن اس میں صرف خودداری سے ہے

ہمتلے آفاق میں جو بے تراب (۱) لوٹتا ہے اس کی خاطر آفتاب

تن پہ اپنے جو بھی قابو پا گیا — وہ نگینِ خاتمِ دولت بنا

فاتحِ خیبر ہے دنیا میں وہی — ساقیِ کوثر ہے عقبیٰ میں وہی

وہ خود آگاہی سے ہے دستِ خدا — اور یدِ اللّٰہی سے ہے فرماں روا

ہے وہی دروازۂ شہرِ علوم — زیرِ فرماں اس کے نجد و چین و روم

حکمراں ہو تو بھی اپنی خاک پر — اپنے انگوروں کی مے سے شغل کر

خاک ہو نا مذہبِ پروانگی — "تو ترابیت" میں ہے مردانگی

سنگ بن اے مثلِ گل نازک بدن — تاکہ ہو بنیادِ دیوارِ چمن

اپنی مٹی سے تو اک آدم بنا — اور اس آدم سے اک عالم بنا

تو بنا پایا نہ گر دیوار و در — غیر اس مٹی سے بنوائیں گے گھر

اے کہ جو رِ چرخ سے ہے آج تنگ — جام تیرا شاکیِ بیدادِ سنگ

آہ و زاری اور ماتم تا بکے — سینہ کوبی ہائے پیہم تا بکے

بس عمل ہی میں ہے مضمونِ حیات — "لذتِ تخلیق قانونِ حیات"

اُٹھ کے خلّاقِ جہانِ تازہ ہو — شعلہ در دامنِ خلیل آوازہ ہو
ہے جہاں دشمن تو اس سے ساز کیوں — تو ہو میداں میں سپر انداز کیوں
مردِ خوددار اور جو ہے پختہ کار — اس کا ساتھی ہے مزاجِ روزگار
سازگار اس کو نہ ہو گر یہ جہاں — ہوتا ہے تب وہ حریفِ آسماں
کرتا ہے تبدیل موجودات کو — دیتا ہے ترکیب نو ذرات کو
گردشِ ایام لوٹاتا ہے وہ — چرخِ نیلی فام تھرّاتا ہے وہ
اپنے دم سے کرتا ہے وہ آشکار — عہدِ نو جو اس سے ہو گا سازگار
شانِ مردانہ نہیں گر زیست کی — مرنا، مُردوں کی طرح ہے زندگی
جانچتا ہے صاحبِ تاب و سیم — اپنا دل آتشِ ہمّتِ عظیم
خاکیوں سے عشق کرنا چاہیے — پھول چُن مثلِ خلیل اس آگ سے
ممکنات نہ ہو مردِ کارداں — ہوتے ہیں مشکل پسندی سے عیاں
بزدلوں کا حربہ بیزاری ہے بس — زیست کا آئین یہ جاری ہے بس
زندگانی قوتِ پیدا ہے صرف — اصل اس کی ذوقِ استیلا ہے صرف
ضعف اس کا کیا ہے؟ عفوِ ناروا — سکتہ ہے یہ زندگی کے شعر کا
جو بھی ذلّت کے گڑھے میں بس گیا — ناتوانی کو قناعت کہہ اٹھا

زندگی سے یہ چرا لیتی ہے دَم
جھوٹ اور ڈر کو بھی دیتی ہے جنم

ناتوانی میں نہیں خوبی کوئی
دودھ پر پلتی ہے اس کے ہر بدی

ہوشیار اے صاحبِ عقلِ سلیم
گھات میں بیٹھا ہوا ہے یہ عدیم

دھوکا مت کھانا اگر ہوشیار ہے
یہ بھی گرگٹ کی طرح مکّار ہے

اس کو پہچانے نہ اکثر دیدہ ور
پردے ڈالے اس کے روئے نحس پر

رحم و نرمی اس کے پردے بن گئے
انکسار اک آڑ ہے اس کے لیئے

گاہ پنہاں شکلِ مجبوری میں ہے
اور کبھی پوشیدہ معذوری میں ہے

رخ تن آسانی اسی کا ہو گیا
صاحبِ قوت کا دل اس نے لیا

زور سچ کے ساتھ لیتا ہے جنم
تو ہے خود آگہ تو ہے خود آگہ تو ہے جنم

زندگی کتنی ہے حاصل زور سے
شرحِ رمزِ حق و باطل زور سے

مدعی قوت سے کرتے خود کفیل
اس کا دعویٰ آپ ہے اپنی دلیل

آتی ہے باطل میں اس سے شانِ حق
خود کو حق کہہ اٹھتا ہے بطلانِ حق

اس کا نخل زہراب کو کوثر بنائے (۱) خیر کو گر شر کہے تو شر بنائے

تو کہ آداب اماننے سے ہے دور
دونوں عالم سے ہے بہتر کر شعور

ہو رموزِ زندگی سے باخبر
بے دھڑک بس ظلم غیر اللہ پہ کر

بن کے مختارِ جواں اب زندہ رہ
پھر اگر بھٹکے تجھے دیوانہ کہہ

(۱۲)

حکایت

سندھ کا ایک نوجوان حضرت سید مخدوم علی ہجویری کی خدمت میں آیا اور دشمنوں کے ظلم کا شکوہ کیا۔

سیدِ ہجویر مخدوم اُمم ۱۱ خواجہِ جن کی قبر کو سجدہ حرم
نوجواں آکر سب بنہ باستاں کبار ہند میں لائے جو سجدوں کی بہار
بندہ مومن ز حق نومید گشت ۲۱ حق کا ان کی بات سے نہ ہو ۱۲
نوجواں از ظلمِ کفر آمد بتنگ تھا انہیں سے خانۂ باطل خراب
خاک پنجاب از دمِ او زندہ گشت ان کے سوز سے سحر تھی کوئی
عشق و رنج و صدق و تاب و سوزِ عشق سر بسر اک نغمۂ اسرارِ عشق
کیستا حق اب اک کمال ان کا بیاں غنچے میں کرتا ہوں مضمونِ گلستاں
نوجواں از ظلمِ کفر آمد بتنگ آیا تھا لاہور میں اک مردِ مرد
پیشِ پیرِ سیدِ الاجناب تا کہ ظلمت دور گردد آفتاب

بولا محصورِ صفِ اعداء ہوں میں — پتھروں کی زد میں اک بینا ہوں میں
کیجیے تعلیم اے گردوں مکاں — زندہ رہنا دشمنوں کے درمیاں
پیرِ دانا جن کی ہستی میں جمال — تھا اسیرِ رشتۂ مہر و جلال
بولے اے نامحرمِ رازِ حیات — جان لے انجام و آغازِ حیات
چھوڑ دے اندیشۂ اغیار کو — قوتِ خوابیدہ سے بیدار ہو
شیشہ جو ہی خود کو جانا سنگ نے — شیشہ بن کر اپنے ٹکڑے کر لیے
خود کو جب کمزور سمجھا راہرو — دے گیا وہ نقدِ جاں قزاق کو
آب و گل سمجھے گا خود کو تا کجا — شعلۂ طور اپنی مٹی سے اٹھا
تو قوی ہے سرگراں ہے کیوں — تکیہ کرتا ہے زمیں پر کیوں
سچ یہ ہے دشمن بھی تیرا یار ہے — گرم اس سے ہی ترا بازار ہے
ہے خودی کی شان جس پر آشکار — کہتا ہے دشمن کو نسلِ کردگار
کشتِ انساں پر ہی ہے ابرِ کرم — کہکشاں اس کے جگر سے ہے بہی
سنگِ رہ پانی ہے ہمت چاہیے — سیل کب رکتی ہے سدِ راہ سے
راہ کا پتھر! فسانِ تیغِ عزم — قطعِ منزل! امتحانِ تیغِ عزم
مثلِ حیواں کھانا اور پینا ہی کیا — گر بخود محکم نہیں جینا ہی کیا

تجھ کو اگر محکم کیا نورِ خودی — لوٹ سکے جا سکے تو دنیا آج ہی

مرنے سے تو فرصت پا آزاد ہو — بیٹھ کے تو خود میں ہی آباد ہو

موت کیا ہے؟ از خودی غافل شدن — تو نے کیا سمجھا؟ فرازِ جان و تن!

گر خودی میں موت ہے یہ مقام — سخت تر کیا زندگی سے ہے مجھ خرام

بس خودی کی موج مرد کامل بن — مرد حق بن حاصلِ اسرار بن

تجھ میں اب تو انتہا کیوں نہ ہو — نور دم سے خود بنا کیوں نہ ہو

"نہ سخنِ آں باش کہ مرد ابراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں"

حکایت

آم پیڑ یاں کا جو پیاس سے بیتاب تھی

ایک جڑیا پیاس سے تھی نڈھال — دم تھا اس کے سینے میں جیسے وبال

باغ میں جب کوئی نہ دیکھا کر — فطرتاً اب اس کو سمجھی خیرہ سر

تھا لب جو اک درختِ سیب — وہ حقائق سے جسے سمجھی تھی اب

آبِ گوہر میں کہاں ملتی نمی
پیاس اس کو پا کے بھی باقی رہی

بولا ہیرا اے گرفتارِ ہوس
تیز مجھ پہ کی ہے منقارِ ہوس

دیکھ میں ساقی نہیں قطرہ نہیں
میں کسی کے واسطے جیتا نہیں

مجھ کو کیا توڑے گی تو اے خیرہ سر
اے حیاتِ خود نمائے بے خبر

باز کی منقار مجھ پر ٹوٹ جائے
چاٹ لے گر آدمی دم چھوٹ جائے

مدّعائے دل نہ چڑیا کو ملا
ہیرا اس کو چھوڑنا ہی پڑ گیا

حسرت اس کے دل میں گویا ایسی
اب نوا کیا تھی بس اک فریاد تھی

شاخِ گل پر قطرۂ شبنم بھی تھا
مثلِ اشکِ چشمِ بلبل رو نما

تاب کرنوں کے لیے مجھ سا نہ
لرزہ تن میں دل میں سورج سے ہراس

ایک گردِ دل زادہ بے چین سا
خود نمائی کو تھا دم بھر رک گیا

غنچۂ گل سے جو دھوکے کھا گیا
زندگی سے اس نے کچھ سیکھا نہ تھا

مثلِ اشکِ عاشقِ دل زادہ تھا
زیبِ مژگاں گرنے پر آمادہ تھا

پیاسی چڑیا زیرِ شاخِ گل گئی
بوند شبنم کی دہن میں آ گری

پا بتا ہے دشمنوں سے گر مفر
پوچھتا ہوں کیا ہے؟ قطرہ یا گہر؟

پیاس کی گرمی سے جب چڑیا جلی
دوسرے کی زندگی اپنا گئی

سخت گوہر کی طرح قطرہ نہ تھا ہیرا باقی رہ گیا وہ چل بسا

ہو نگہبانِ خودی اے جانِ من ریزہِ الماس بن شبنم نہ بن

پختہ فطرت صورتِ کہسار ہو حاملِ صد ابرِ دریا بار ہو

خود کو پہچان اپنے ہی ایجاب سے چاند ہی بن جا اپنے ہی سیماب سے

نغمہ زا ہو چھیڑ کر تارِ خودی

آشکارا کر دے اسرارِ خودی

ہیرے اور کوئلے کی کہانی

کرتا ہوں ظاہر حقیقت اک نئی اب سناتا ہوں کہانی دوسری

کوئلہ میں ہیرے سے بولا کوئلہ تو امیں ہے لازوال انوار کا

ہم ہیں ہمدم ایک ہی ہے ہست بود ایک ہے دراصل دونوں کا وجود

میں یہاں مرتا ہوں ٹھکرایا ہوا تاجِ شاہی سے ترا رشتہ ہوا

قدر میں بہتر ہیں مجھ سے گرد و خاک حسن سے تیرے دلِ آئینہ چاک

نورِ سنگش وال ہیں تیرے خال و خد راکھ تک ہے بس مرے جوہر کی حد

مجھ کو پامالی نصیبوں سے ملی
میری ہستی کو سبھی نے آگ دی

اس سرِ ساماں پہ رونا چاہیے
کیا ہیں اس ہستی کے اجزا جان لے

میں دھواں ہوں ایک پیوستہ غبار
میری دولت ہے فروغِ یک شرار

تو بہر اندازہ تارا بن گیا
ہیں ہر اک پہلو سے جلوے روشنا

گاہ نورِ دیدۂ قیصر ہے تو
گاہ زیبِ دستۂ خنجر ہے تو

بولا ہیرا۔ اے رفیقِ نکتہ بیں
پختہ ہو کر راکھ بنتی ہے نگیں

ہوتی ہے حالات سے جب اسکی جنگ
سخت ہو جاتی ہے وہ مانندِ سنگ

پختہ ہو کر تن مرا روشن ہوا
میرا سینہ جلووں کا مخزن ہوا

خوار ہے تو اس وجودِ خام سے
جل رہا ہے نرمیِ اندام سے

چھوڑ دے خوف و غم و وسواس کو
پختہ مثلِ سنگ ہو الماس ہو

ہوتے ہیں اس سے دو عالم مستنیر
جو یہاں ہو سخت کوش و سخت گیر

سنگِ اسود بھی بنا ہے خاک سے
رونما جو ہے حرم کے چاک سے

رتبہ اس کا طور سے برتر ہے اب
بوسہ گاہِ اسود و احمر ہے اب

ہے صلابت آبروئے زندگی
ناتوانی کیا ہے؟ خامی ناکسی

۱۳

حکایتِ شیخ و برہمن اور مکالمۂ گنگا و ہمالہ

اس معنے میں کہ روایات مخصوصۂ ملّیہ پر گرفت مضبوط رکھنے سے حیات ملّیہ کا تسلسل برقرار رہتا ہے

برہمن کاشی میں تھا اک محترم — تھا وہ غوّاصِ یمِ بود و عدم
فلسفے سے خوب نسبت تھی اسے — حق پرستوں سے ارادت تھی اسے
ذہن نادر کوش تھا گیرا کبھی تھا — عقل تھی بامِ ثریا تک رسا
تھے خیالات اس کے نادر اور بلند — فکر کے شعلے پہ مہر و مہ سپند
خوں سے گویا نے دل رنگین ہوئی — دُور حکمت کی رہی ساقی گری
جال باغِ علم میں اس نے بچھائے — طائرِ معنے بلیکن ہاتھ آئے
فکر کے ناخن سے خوں اسکے بہا — عقدۂ بود و عدم الجھا رہا
آہ بر لب مظہرِ حرماں ہوا — چہرہ غمّازِ دلِ حیراں ہوا
ایک دن اک شیخِ کامل سے ملا — جس کے سینے میں تھا دل انساں کا
بات اس نے شیخ کی سن لی سبھی — اور لبوں پر مُہرِ خاموشی رکھی

بولا شیخ، اے طائفِ اوجِ سما — خاک سے عہدِ وفا کر لے ذرا
چونکہ تیرا فکر ہے گردِ دلِ نورد — اس لیے اب تو ہے اور صحرا کی گرد
کچھ تو نسبت اس زمیں سے بھی رہے — جستجو ہی کیوں ستاروں کی رہے
میں نہیں کہتا صنم بیزار ہو — کفر تو شائستۂ زنّار ہو
"اے امانت دارِ تہذیبِ کہن" — دیکھ! مت ٹھکرا بزرگوں کا چلن
ہے اگر ملّت میں جمعیت سے جاں — کفر بھی ہے اس کی اک قدرِ گراں
کافری میں بھی جو تو کامل نہیں — لائقِ طوفِ حریمِ دل نہیں
دونوں سے ہے جادۂ تسلیم دُور — تجھ سے آذر مجھ سے ابراہیم دُور
اپنا مجنوں عاشقِ محمل نہیں — وہ جنونِ عشق میں کامل نہیں

دل سے جب نورِ خودی جاتا رہا
ان فلک پیمائیوں سے فائدہ؟

دامنِ کوہِ ہمالہ تھام کر — رودِ گنگا نے کہا اے نامور
تو ازل کی صبح سے ہے یخ بدوش — جسمِ دریاؤں سے ہے زنّار پوش
گرچہ فیضِ حق سے یہ رفعت ملی — طاقتِ رفتار لیکن چھن گئی
جبکہ تجھ میں دم نہیں رفتار کا — رفعت و تمکین سے کیا ہے فائدہ؟

زندگی تو موج کی ہستی سے ہے — زندگی ہستی سے خرام پے بہ پے

ایسا بپھرا بحرِ آتش ہو گیا — کوہ نے دریا سے جب طعنہ سنا

تجھ سی ندیاں پالتا ہوں میں کئی — بولا۔ سن لے تو ہے مشاطہ مری

خود سے جو گزرا ہے شایانِ فنا — یہ خدا چلنا ہے سامانِ فنا

ناز کرتی پھرتی ہے نقصان پر — کیا ہے تو۔ اس کی نہیں تجھ کو خبر

نقدِ جاں رہزن کے آگے رکھ چلی — خود سمندر کے حوالے ہو گئی

بہرِ نشرِ بو جا گلچیں کے پاس — گلستاں میں مثلِ گل ہو خود شناس

اور چھپتے رہنا گلہائے خودی — زیست ہے اپنی جگہ بالیدگی

تو یہ سمجھی دور ہے منزل مری — میں اٹل کل بھی تھا اور ہوں آج بھی

میرا دامن بسترِ پرویں ہوا — ہے ہوا بالیدہ اونچا اٹھ گیا

میری چوٹی مہر و مہ کی سجدہ گاہ — ہے سمندر میں تری ہستی تباہ

سنتا ہوں آوازِ پروازِ ملک — دیکھتی ہے آنکھ اسرارِ فلک

تب کہیں لعل و گہر مجھ کو ملے — جل چکا جب سوزِ سعی و جہد سے

آب ما بر نارِ من نبود گزار — در دلم سنگ و اندر سنگ نار (*)

(*) مولانا روم بتغیرِ الفاظ — مجھ میں پتھر اور پتھر میں آگ ہے + میری آگ پر پانی کا گزر ممکن نہیں

قطرہ ہے تو خود کو نیچے مت گرا — لڑ سمندر سے بھر کر اکھڑ ذرا
آب گوہر لے کے گوہر ریزہ بن — بہر گوش حسن اک آویزہ بن
یا خود افسر ابن سبک رفتار بن — ابر برق انداز و دریا بار بن
بحر طوفانوں کی تجھ سے بھیک لے — شکوہ سنج تنگیِ داماں ہے
خود کو وہ موجوں سے کم تر جان لے
تیرے قدموں میں پڑا بہتا رہے

(۱۴)

مسلماں کی حیات کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے اور وہ جہاد
جس کی محرک ہوس ملک گیری ہو مذہب اسلام میں حرام ہے
رنگ سے اللہ کے دل رنگ لے — عشق کو ناموس و نام و ننگ دے
عشق ہو مسلم میں تو قاہر ہے وہ — ہو نہ گر عاشق تو اک کافر ہے وہ
تابع حق رکھتا ہے وہ چشم و گوش — خواب و بیداری اور اپنا خورد و نوش
مرضیِ حق اس کی مرضی میں سمائے — قول یہ لوگوں کو باور کیسے آئے
حق کا میداں ہے اسی کی خیمہ گاہ — نزع انساں پر وہی ہے بس گواہ
ہیں گواہ اس کے نبی انس و جاں — شاہد اک صادق ترین شہداں

قال چھوڑ اور رہ شناسِ حال ہو — کر منوّر ظلمتِ اعمال کو

شانِ درویشی سے کشورِ دین — مردِ حق آگاہ و واقف کار بن

ہر عمل ہو جو حق سے خوش خدا — تاکہ ہو تجھ سے عیاں حق کا جلال

صلح نہ ہے مقتضا جس کا غیر — مدعی اللہ ہو تو جنگ خیر

ہو نہ جرأت سے حق کی عظمت آشکار — قوم کو وہ جنگ کر دیتی ہے خوار

حضرت شیخ میاں میر ولیؒ — جن کے جلی ہے نور سے جن کے جلی

تھا طریقِ مصطفےٰ ان کا شعار — عشق و الفت کے تھے سازِ نغمہ بار

مرکزِ بالا ہے میرے شہر کا — ان کا مرقد مشعلِ نورِ ہدیٰ

ان کے در کو چومتے ہیں آسماں — تھا مرید اُن کا شہِ ہندوستاں

وہ دکن جس میں جب آگیا — مُلکِ گیری کا ارادہ کر لیا

اور نفس کی آگ تھی اتنی شدید — تھا زبانِ تیغ پر ھَلْ مِنْ مَّزِید

تب دکن میں شورش بسیار تھی — فوجِ شہ رخ گیر و دار تھی

شہ پہنچا آستانِ شیخ پر — تاکہ مل جائے دعائے زود اثر

ہو گئے حق ہو نا ہے مسلم کا سفر — ہو دعا سے تاکہ کوشش کارگر

شاہ نے ہے کی سنی ورچپ رہے — اور سب درویش بھی خاموش تھے

اک مرید اتنے میں اک درہم لیے
بولا خاموشی کا جادو توڑ کے

لیجئے یہ نذر اے روشن ضمیر
راہِ حق گم کردگاں کے دستگیر

تر ہوئی ہے جب پسینے سے جبیں
تب بچایا ہوں یہ درہم کہیں

شیخ نے فرمایا درہم بخش دو
جامہ شاہی میں اس کنگال کو

حکمراں افلاک دیجور و برہنہ ہے
پھر بھی یہ مفلس زمانے بھر سا ہے

خوان پر غیروں کے ہیں نظریں لگی
بھوک سے اس کی یہ دنیا جل گئی

اک بلا ہے چل گئی جب اس کی تیغ
مٹ گئی دنیا اٹھی جب اس کی تیغ

اس کی ناداری سے نالاں ہیں سبھی
جس نے کمزوروں کی دنیا لوٹ لی

اس کی سطوت سے لٹے اہلِ جہاں
یہ ہے رہزن نوعِ انساں کارواں

اُف خیالِ خود فریب و فکرِ خام
رکھ لیا تاراج کا تسخیر نام

فوجِ شاہی ہو کہ ہو فوجِ غنیم
دونوں اس کی بھوک سے اب ہیں سقیم

مرتے ہیں سائل تو اپنی بھوک سے
ملک و ملت حکمراں کی بھوک سے

جس کا خنجر بہرِ غیر اللہ اٹھا
اپنے خنجر سے وہ خود مارا گیا

(۱۵)

میر نجات نقش بند المعروف بہ بابائے صحرائی کی نصیحت

جو ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے تحریر کی گئی

تو کہ مثلِ گُل اُگا ہے خاک سے — تو بھی فرزندِ خودی ہے جان لے
جَم خودی پیمانۂ بقا انجام بن — قطرہ ہو کر بھی محیطِ آشام بن
تو کہ ہے نورِ خودی سے ضوفشاں — کی خودی محکم تو ہوگا جاوداں
نفع ہے جس میں یہ ہے سودا وہی — ہے تحفظ سے اسی کے خواجگی
نیستی کا ڈر ہے ہستی کو تری — میرے پیارے بھول یہ کیسی ہوئی
چونکہ سمجھا ہوں حقیقت زیست کی — آ بتاؤں تجھ کو کیا ہے زندگی
غوطہ کھانا خود میں مانندِ گہر — پھر اُٹھانا اپنی خلوت گہ سے سر
جمع کرنا راکھ کے نیچے شرر — شعلہ بننا اور جلا دینا نظر
ہاں جلا دے محنتِ کسبِ علوم — شعلۂ جوّالہ بن گرد اپنے گھوم
زندگی ہے طورِ دیگر سے نجات — کعبہ خود کو جاننا اے خوش صفات
تا کے جذبِ خاک سے آزاد ہو — مثلِ طائر بھول جا آفتاد کو
گر نہیں طائر تو پھر اے دیدہ ور — غار کے منھ پر نبرد آزما نہ کر

تو کہ کوشاں ہے پئے کسبِ علوم — سن تا جا مجھ سے پیامِ پیر روم

"علم را بر تن زنی مارے بود (*) — علم را بر دل زنی یارے بود"

سن چکا ہے؟ قصۂ استادِ روم — جو حلب میں دیتا تھا درسِ علوم

وہ جو تھا پابندِ توجیہاتِ عقل — اور غریقِ دخمۂ ظلماتِ عقل

موسیٰ ناواقفِ سینائے عشق — سوز دل میں اور نہ کچھ سودائے عشق

کچھ تشکک اور کچھ اشراق سے — گفتگو تھی گو ہر حکمت لیے

نکتہ ہائے قولِ شائیں جو تھے (۱) — اس کے نورِ فکر سے روشن ہوئے

ہر طرف رکھتا تھا انبارِ کتب — لب پہ رقصاں شرحِ اسرارِ کتب

پیرِ تبریزیؒ کو تھا حکمِ کمالؒ (۲) — پہنچے اک دن کتبِ ملا جلال

اور فرمایا یہ قیل و قال کیوں — یہ قیاس و وہم و استدلال کیوں

موسوی بولا خوش اے بے خبر — طنز ایسے قولِ سکراتی پہ نہ کر

میرے مکتب سے نکل۔ باہر تو جا — یہ ہے قیل و قال تجھ سے گا کیا

"قال" میرا جس سے تو ہے اجنبی — روشنی ہے شیشۂ ادراک کی"

(*) علم ہو تن کے لئے تو مار ہے — علم ہو دل کے لیے تو یار ہے

سوزِ عشق آہن بن کے بڑھنے لگا — جانِ تبریزی سے اک شعلہ اٹھا
فرش پر برق نظر فوراً گری — سوزِ دم سے خاک شعلہ بن گئی
خرمنِ ادراک جب سے جل اٹھا — فلسفی کا سارا دفتر راکھ تھا
نوحہ گر نہ واقفِ اسرارِ عشق — "ناشناسِ نغمہ ہائے سازِ عشق"
جب اٹھا یہ آگ میرا کیسے کی — سب بناءِ علم و حکمت پھونک دی
شیخ جی سے ہم کفر آشنا — یہ ہے ذوقِ وصال تو سمجھے گا کیا
حال میرا ہے تجھ سے تیری دور — کیمیا ہے میرے اس شعلے کا نور
تو نے پائی برتنِ حکمت سے بہا — ہے حسابِ فکر تیرا ژالہ بار
آگ ان خاکوں سے پیدا کر ذرا — شعلہ اپنی خاک کو تو بھی بنا

علمِ مسلم سوزِ دل کا نام ہے (۱) ترکِ آفل معنیِ اسلام ہے

"ترکِ آفل جب ابراہیمؑ نے
مشعلوں کے نرغے میں خوش بیٹھے رہے

ظلمِ حق تبریزی نغمے سے گر گیا — نقدِ دیں روٹی کی خاطر دے دیا
جستجوئے سرمہ میں ہے در بدر — اپنی آنکھوں کی سیاہی بھول کر
آگ اب تجھ سے آبِ زندگی — اشک ہے کے منھ سے کوثر کی نمی

سنگِ اسود لے درِ بت خانہ سے
مشک کا نافہ سگِ دیوانہ سے

سوزِ عشق اور دانشِ حاضر چہ خوب
کیف حق اور ساغرِ کافر چہ خوب

ہیں کہ مدت تک تگ و دو میں رہا
رازدانِ دانشِ نو ہو گیا

باغبانوں نے لیا جب امتحاں
تب بنا یارا زدارِ گلستاں

گلستاں یہ عبرتوں کا لالہ زار
کاغذی پھولوں کی ہے اس میں بہار

چھوڑ کر آیا ہوں جب یہ گلستاں
نخلِ طوبیٰ پر ہے میرا آشیاں

دانشِ نو ہے حجابِ عقل و ہوش
بت تراش و بت پرست و بت فروش

یہ حدودِ حس میں گھر کر رہ گئی
قیدِ زندانِ مظاہر میں ہوئی

اور صراطِ زندگی سے گر گئی
پھر لی اپنے گلے پر خود چھری

لالہ نہ کہیے اس کی آگ کو
شعلہ سرد اتنا کہ اولا بھی نہ ہو

اس کی فطرت سوزِ الفت سے تہی
جستجو کے ذوق سے عاری رہی

عشق ہے دانائے علت ہائے عقل
جس کے نشتر سے کٹے سودائے عقل

کُل جہاں ساجد ہے اور مسجود عشق
بتکدے میں عقل کے محمود عشق

عشق اس دانش میں دیکھا ہے کہیں!
شورِ "یا رب" اس کی راتوں میں نہیں

تو نے اپنی قدر پہچانی نہیں — غیر کی عظمت پہ کر بیٹھا یقیں
مثلِ نے خود سے ہی خالی ہو گیا — ہو گیا عاشق نوائے غیر کا
اے گدا دریوزہ چینِ خوانِ غیر — خوش اپنی شے کی اور دکانِ غیر
بزم میں شعلے پرائے غیر سے — جل گئی مے شرارِ دیر سے
جب سوادِ کعبہ سے آ ہو ہٹا — ناوکِ صیاد کی زد میں گیا
مثلِ بوئے گل پریشاں بے محل — خود سے تو بھاگا ہے اپنے رخ پہ چل
تو کہ ہے قرآں کی حکمت کا امیں — ڈھونڈ لے کھوئی ہوئی وحدت کہیں
قلعۂ ملت کے گو دربان ہیں ہم — چھوڑ کر مذہب نہیں کافر سے کم
اب کہاں پہلی سی وہ ساقی گری — بزمِ رندانِ حجازی لٹ چکی
بت ہمارے کعبے میں اب آ گئے — خندہ زن اسلام پر کافر ہوئے
اور بتوں کے عشق میں دیں بات کے — کفر جوڑا شیخ نے اسلام سے
بال جن کے ہوں سفید اب وہ ہیں پیر — کھیل بچوں کا بنے ہیں یہ شریر
قلب ان کا لا الٰہ بیگانہ ہے — حرص کے اصنام کا بت خانہ ہے
ہو گیا ہر زلف والا خرقہ پوش — آہ یہ سوداگران دیں فروش
ہیں جو کرتے روز و شب سفر — دردِ ملت سے ہیں عالم بے خبر

آنکھیں اندھی چشمِ نرگس کی طرح
سینے خالی جیبِ مفلس کی طرح

واعظ و صوفی ہوئے منصب پرست
احتسابِ قوم نے پائی شکست

اپنا داعی ہے نہ بت کدہ
فتوؤں کا تاجر ہے مفتی آج کا

دوستو سوچو کوئی تدبیر آج
چھین دیا چلنے ہمارا تیر آج

---

(۱۶)

اَذُوقُتُ سَیْفٌ (وقت تلوار ہے)

گُل فشاں ہو خاکِ پاکِ شافعیؒ
ان کی مے سے سب کو مستی مل گئی

فکر نے ان کے کواکب چن لیے
سیفِ بُرّاں وقت کو وہ کہہ گئے

کیا بتاؤں راز اس شمشیر کا
تیغ ہے یہ حالِ آبِ بقا

اس کا مالک فاتحِ امید و بیم
ہاتھ جس کا رشکِ دستِ کلیم

سنگ اس کی ضرب سے ہوتا ہے تر
خشک ہو کر بحر بن جاتا ہے بر

دستِ موسیٰ میں یہی تلوار تھی
کب کوئی تدبیر انھیں درکار تھی

کر دیا دریائے احمر اس نے چاک (۱) اور سمندر کو سکھایا مثلِ خاک

ساقیِ حیدرؑ کہ خیبر گیر تھی — اس کی قوت ہی یہی شمشیر تھی

گردشِ افلاک پر کر لے نظر — انقلابِ روز و شب پر غور کر

محوِ کے قید ہی بچشم خود دیکھ — اپنے دل میں ایک دنیا اور دیکھ

تخمِ ظلمت اپنے دل میں بو دیا (۱) وقت کو بھی ایک خط سمجھا کیا۔

لے کے پھر یہ لیل و نہار — ناپنے بیٹھا ہے طولِ روزگار

کر لیا اس رشتے کو زنار دوش — ہو گیا مثلِ بتاں باطل فروش

کیمیا تھا اور مشتِ گل بنا — سرِّ حق پیدا ہوا باطل بنا

اے مسلماں چھوڑ اس زنار کو (۲) — شمع بزمِ ملتِ احرار ہو

تو کہ ہے اہلِ زماں سے بے خبر — ہے حیاتِ جاوداں سے بے خبر

روز و شب کی قید آخر کس لیے (۳) — ملتِ احمد ہے رازِ وقت لے

ہے سحر کیا روحِ رفتارِ وقت — زیست ہے مجملِ اسرارِ وقت

نیرِ تاباں نہیں معیارِ زماں — وقت ہے دہرِ ہے جاوداں

عیش و غم ماضی و روزِ عید وقت (۴) — ہے تو پیرِ مہ و خورشید وقت

وقت کو مثلِ مکاں پیدا دیا — امتیازِ دوش و فردا کر لیا

اڑ کے مثلِ بوئے خود اپنے باغ سے — زندگی آلِ ہبا کا ناپنے لیے

وقتِ آدم سا نہیں کوئی سِرا — یہ ضمیرِ آدمی سے ہے اُگا
زندہ اس کی معرفت سے زندہ تر — ہوتا ہے وہ صبح سے تابندہ تر

اصل میں ہیں ایک دہر و زندگی
لَاتَسُبُّوا الدَّھْرَ ہے قولِ نبیؐ (۱)

نکتہ سمجھاؤں تجھے اک مثلِ دُر (۲) ہو تجھے پھر امتیازِ عبد و حُر

عبد کو چکراتے ہیں لیل و نہار — اور دلِ حُر میں ہے غلطاں روزگار
عبد روز و شب سے بُنتا ہے کفن — ہے یہی اس کے لیے بس پیرہن
آب و گِل سے ہو کے آخر حُر جدا — پیرہن بنتا ہے خود ایّام کا
عبد اک طائر بہ دامِ صبح و شام — لذّتِ پرواز ہے جس پر حرام
سینۂ حُر سینۂ چاکِ نفس — طائرِ ایام کا سنگیں قفس
عبد ہے تحصیلِ حاصل کا اسیر — رکھتا ہے ایجاد سے خالی ضمیر
حلقۂ زنجیر میں اس کا قیام — شغل اس کا نالہ ہائے صبح و شام
دم بدم ایجادِ نو کی حُر کو دُھن — ساز سے اُٹھتی ہے اس کے تازہ دھن
اس کا دل تکرار پر آتا نہیں — دائرے میں وہ چلے جاتا نہیں
روز و شب ہیں عبد کی زنجیر پا — روتا ہے تقدیرِ بیکارہ ناسزا

ہیبتِ حرفِ قضا کی ہے مشیر — جس کے ہاتھوں حادثے ہوتے ہیں زیر

آج اور کل سب ہیں سکتے حال میں — عجلتوں میں اس کی تاخیریں ملیں

یہ سخن صوت و صدا سے پاک ہے — ماورائے چشم و ادراک ہے

حرفِ معنی سے ہے دشمن مدعا — شکوۂ معنی سے ہے اس کو واسطہ

زندہ معنی حرف بن کر مر گیا — سوز اس کا تیرے دم سے جل بجھا

دل ہے بس نکتہ غیب و حضور — اور وہیں ہے رمزِ ایام و مرور

کیوں ہے خاموش نغمہ سازِ وقت

ڈوب کر دل میں سمجھ لے رازِ وقت

آ دکھا دوں تجھے کہ سیفِ روزگار — تھی ہمارے آہنیں بازو کی یار

تخم وہ ہم نے دلوں میں بو دیا — عارضِ حق رونما ہم نے کیا

عقدے کھولے ہم نے دنیا کے سبھی — سجدوں سے قسمت جگا دی خاک کی

کی عطا ہم نے حق نظم و سحر — کہنہ میخانوں پہ شبخوں مار کر

اے کہ تیرے شیشۂ میں ہے کہنہ مے — گردشِ مے سے یہ شیشہ تب ہے

تو ہے ان نخوت غرور و کبر و ظن — کیوں ہمارے حال پر ہے طعنہ زن

خواہ ہم ہوں کشتۂ زیبِ بزم — سینے میں دل رکھتے ہیں اور دل ہیں ہم

یہ ہماری آرزو کہ ہے خطا — عصرِ نو ہے بلوغِ آدمیت
کشتۂ حق اپنے ہوسے سینچ دی — اہلِ حق آ کے باغبان آج بھی
ہم سے ہی انکی زندگی کی ملی — اپنی کتابوں کے ساتھ آگئی
حرفِ تعزیم سے دنیا لرزا دیا — حق نے ہم کو اسکی فرمان کیا
اب نہیں گر صاحبِ تاج و سریر — ہے فقیروں کا کوئی ہے امیر
تو سمجھتا ہے زیاں کا راب ہمیں — خوار و زبوں سود و تیغ لئے ہیں
اعتبارِ لالہ و گل ہے ہم — دونوں عالم پہ گئے ہیں ہم
اور غمِ امروز و فردا چھوڑ کے — ہم کسی سے عہدِ الفت کر چلے
قلبِ حق میں سرِ کنول ہیں ہیں — وارثِ موسیٰ و ہارون ہیں ہیں
روشنی ہے آفتاب و ماہ کی — اس گھٹا میں بجلیاں ہیں ہیں

ذاتِ حق کا آئینہ ہے اپنی ذات
ہم ہیں آیاتِ حق کی ہیں صفات

(۱۷)

ترجیع

[illegible] کیا [illegible] جہاں

[illegible] قہر پہ جاں دینا ہے [illegible]

[illegible] ہو [illegible] آباد ہو

[illegible] نام کو [illegible] نام کو

[illegible] ہم [illegible]

[illegible] (۲) تاکہ [illegible]

[illegible] مثال [illegible]

[illegible] ہم [illegible] گئے

[illegible] ہوتے [illegible]

[illegible] کی [illegible] کو دے نا نہ گی

[illegible] نام کو [illegible] کوئی کام لے

رہروِ دل کو منزلِ تسلیم دے
قوّتِ ایمانِ ابراہیمؑ دے

شغلِ لا سے عشق کو آگاہ کر
آشنائے رمزِ الّا اللہ کر

شمع سال ہے دوسروں کا غم مجھے
سوزِ دل اک کہہ رہا ہے دل بزم سے

یارب! اک آنسو کہ جو ہے دل فروز
"بے قرار و منتظر و آرام و سوز"

باغ میں بو دوں تو وہ شعلہ اُگے
آگ جو دھو دے قبائے لالہ سے

یادِ ماضی اور کل کا انتظار
بزم میں تنہا ہوں ساتھی ہے نہ یار

دیکھئے جس کو وہ ہے ہمدم مرا
کوئی بھی میرا نہیں رازِ آشنا

ہم نفس دنیا میں میرا ہے کہاں
طورِ ہستی میں مرا موسیٰ ہے کہاں

اپنی جاں پر ظلم یہ میں نے کیا
پرورش دامن میں شعلہ کر لیا

شعلہ اک غارت گرِ سامانِ ہوش
جس نے خاکستر کیا دامانِ ہوش

عقل ہے نم پوانگی اس نے جگائی
علم کی ہستی کو آگ اس نے لگائی

مثلِ شبنم دیدۂ گریاں ہوا
سوزِ پنہاں دل کو آخر مل گیا

شمع کو سوزِ عیاں میں نے دیا
چھپ کے سب نے دیکھ کر جلنے لگا

ہر کرن سے اٹھے شعلے ہزار
ہو گئی موجِ تخیل شعلہ بار

میرے بلبل نے شرارے چگ لیے — اس کے نغمے آگ برسانے لگے
حسرتوں کا سینہ ہے دل سے تہی — قیس ہے بے تاب لیلیٰ کھو گئی
جلوہ تنہا شمع کا آساں نہیں — ایک پروانے سے شایاں نہیں
انتظار رخ سے بے تاب کے — جستجوئے راز دار اب تاب کے
نجم و مہ روشن ہیں تیرے نور سے — آگ اپنی مجھ سے یا رب پھیر لے
یہ امانت پھیر لے اس سینے سے — خار جوہر کھینچ اس آئینے سے
یا مجھے اک ہمدم دیرینہ دے — عشق عالم سوز کو آئینہ دے
ہے مقدر ان دنوں میں رہے — ساتھ ہمدم کے تڑپنا ہے اسے
تارے سے تارے کی ہے برہم دستی — قرب کے زانو پہ ہے فرق ماہ بھی
دن اندھیری رات کے ہے سکنار — ہو گئے امروز و فردا رشتہ دار
نہر میں گم ہو گئی ہے بیتاب نہر — اور خوشبو میں صبا کی تیز لہر
ہائے یہ جوش دم ہے ویرانے کے ساتھ — رقص میں دیوانہ دیوانے کے ساتھ
گرچہ ہیں انسان سے یکتا ہے تو — اپنی خاطر ہی جہاں آرا ہے تو
کیوں مثال لالۂ صحرا ہوں میں — درمیان انجمن تنہا ہوں میں
چاہتا ہوں کہ ہے اک غمگسار — جو کہ فطرت کا مری راز دار

وہ جو دیوانہ کبھی بے خرد انہ کبھی — اپنی و آل کی فکر سے بیگانہ کبھی

تاکہ اس کی جال کہ اپنا نور دوں — آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ لوں

ڈھال دوں پیکر وہ اپنی خاک سے

خود بت و بت گر بنوں جس کے لیے

کتابیات

"اسرارِ اقبال" میں جن کتابوں کی انگریزی عبارتوں کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے ان کے نام اردو ترجمہ کے ساتھ حسبِ ذیل ہیں۔ آئندہ صفحات میں انہیں ہی حوالہ دیا گیا ہے۔

اقبال: اسلامی ثقافت کا تشکیل نو

IQBAL - Reconstruction of Religious Thought In Islam-LAHORE, 1944

ایس اے وحید: اقبال، ایک مطالعہ

S. A. Vahid-Iqbal His Art & Thought

Lahore, 1944

اقبال: مکتوب بنام ایڈورڈ تھامپسن (تعارف)

IQBAL - Letter to Edward Thompson

(Introduction to Secrets of the Self) LAHORE, 1944

خواجہ غلام السیدین: اقبال کا تصورِ خودی

K. G. Saiyidain - Iqbal's Concept of Personality

Lahore, 1945

"ول دورال :۔ سرور فلسفہ

WILL DURANT -- Pleasures of Philosphy

New York -- 1953

پروفیسر نکلسن :۔ ترجمہ اسرار خودی

Prof. R.A. Nicholson, Secrets of the self LAHORE,

1944

عربی۔ فارسی اور انگریزی کی لغات

Dictionary, Persian, Arabic and English by Francis

Johnson. London-1852

"اے۔ ایچ۔ جے نائٹ :۔ نطشے کی زندگی اور تصانیف کے چند رُخ

A.H.J. Knight - Some aspects of the life and work

of Nietzche

حاشیے اور حوالے

صفحہ	شمار	حاشیہ
۱۷	۱	اقبال: ضربِ کلیم (وجود و کتاب: فقط جوہرِ خودی کی نمود کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا)
	۲	اقبال: بالِ جبریل (ساقی نامہ)
۱۸	۱	اقبال: دیباچہ اسرارِ خودی (پہلا ایڈیشن)
	۲	اقبال: اسرارِ خودی
	۳	اقبال: اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید، صفحات ۵، ۶۲، ۶۳، ۱۲۳
	۴	اقبال: مکتوب بنام پروفیسر نکلسن (تعارف) صفحہ ۱۷
	۵	ایس۔ اے۔ وحید: اقبال: اس کا شعر و فن صفحہ ۱ (اس باب میں تناسق اور تکوین کا فرق نظر انداز نہیں ہونا چاہیے۔)
۱۹	۱	قدر آفریں = Appreciative مؤثر Efficient
	۲	آنات۔ آن کی جمع ہے۔ آن بمعنی لمحہ۔ ن
۲۰	۱	اقبال: اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید، صفحہ ۱۰۲
	۲	برگساں (Henri Bergson) فرانسیسی ایک برطانوی مستشرق یہودی نسب کا فرد تھا۔ ۱۸۵۹ء میں پیرس میں پیدا ہوا۔ زمان اور وجدان کے بارے میں اس کے خیالات فکر انگیز ہیں۔ اس کا نظریہ "ارتقائے ظہوری" (Emergent Evolution) دراصل ارتقا کا ایک غریب باب ہے جس کے بموجب تخلیق وارفتہ ہجوم حیات کی قوت Elan Vital ہے۔
	۳	واحدِ منبسط = Closed on Unity
	۴	متکلیت = Perfection
۲۱	۱	اقبال: اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید، صفحہ ۲۳

شمار صفحہ	حاشیے	
۲۱	۲	اقبال :- اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید صفحہ ۷۷
	۳	اقبال : " " " صفحہ ۸۴
	۴	حرکتِ موجی کی تیزی = Frequency of Wave Movement
	۵	ہم اپنے موضوع کے اعتبار سے "ارتعاشات" کو درجات بھی کہہ سکتے ہیں
	۶	زمانِ متواتر = Serial Time.
		دوراں = Duration
۲۲	۱	اقبال :- اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید صفحہ ۷۵
	۲	اقبال :- " " " صفحہ ۴۷-۴۸
	۳	قرآن مجید :- القمر (۵۴ : ۵۰)
۲۳	۱	اقبال :- دیباچہ اسرار خودی (پہلا اڈیشن)
	۲	اقبال :- اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید صفحہ ۶۳
	۳	قرآن مجید :- (الاخلاص ۱۱۲)
۲۴	۱	حضرت علیؓ :- نہج البلاغۃ (خطبات) مطبوعہ لاہور ۱۹۶۳ء صفحہ ۱۲۱-۱۲۲
	۲	حضرت علیؓ :- " " " صفحہ ۱۲۰
	۳	حضرت علیؓ :- " " " صفحہ ۱۲۱
		(اللہ کے نفس میں حرکت پیدا نہیں ہوتی۔)
	۴	حضرت علیؓ :- نہج البلاغۃ خطبات صفحہ ۱۲۰
		(جس نے ذاتِ الٰہی میں تقسیم مانی وہ نادان ہے)
	۵	اقبال :- اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید صفحہ ۷۶ (بحوالہ ملا باقر)
۲۵	۱	اقبال :- بال جبریل (ساقی نامہ)
	۲	اقبال :- خودی کا وجود اور اسکی نمود وجود حق اور نمود حق سے ہے

حوالہ جات

۲۶ ۱ خواجہ غلام السیدین ۔ اقبال کا فلسفۂ تعلیم ص۱۰

۲ اقبال ۔ مکتوب بنام پروفیسر نکلسن (تعارف) ص۱۹

۳ اقبال ۔ اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید ص۱۱۱

۴ اقبال ۔ بالِ جبریل (ساقی نامہ)

۵ ایگو (Ego) سے (Self) بھی مراد ہوتی ہے۔ اردو میں یہ لفظ خودی اور انا کے استعمال دونوں سے نفسیات کی دو مختلف اصطلاحات ہیں۔ فرائڈ Sigmund Freud کے نظریات سے خاص نسبت ہے لیکن اقبال کی خودی اور فرائڈ کے ایگو میں کوئی قابلِ ذکر مشابہت تلاش کرنا بے سود ہے۔ چاہیے کہ اقبال فرائڈ کے چند قریب تر نظریات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے (اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید ص۲۵) لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے تصورِ خودی کا خاکہ فرائڈ کے ایگو سے ماخوذ نہیں۔

۶ اقبال ۔ مکتوب بنام پروفیسر نکلسن (تعارف) ص۱۹

۲۷ ۷ اقبال ۔ اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید ص۳۰

۸ کشیدگی ۔ Tension

۹ اقبال ۔ اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید ص۱۰۲

۱۰ من امیتت I-ness

اقبال ۔ اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید ص۷۰

۱۱ اقبال ۔ " " " ص۹۶

۱۲ دل دوراں ۔ سرودِ فلسفہ ص۲۹

۱۳ اقبال ۔ مکتوب بنام پروفیسر نکلسن (تعارف) ص۱۰

۱۴ اقبال ۔ " " " ص۲۱-۲۲

صفحہ شمار حاشیہ

۲۸ ۲ قرآن مجید :- الاحزاب (۳۳ : ۷۲) ؛ اقبال :- اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید صفحہ ۸۵

۳ خواجہ غلام السیدین :- اقبال کا فلسفۂ تعلیم صفحہ ۲

۲۹ ۱ خواجہ غلام السیدین : " " صفحہ ۲۹

۲ ایس۔اے واحد :- اقبال اس کا فکر و فن صفحہ ۴۵-۴۶

۳۰ ۱ اقبال :- مکتوب بنام پروفیسر نکلسن (تعارف) صفحہ ۲۲

۲ ایس۔اے واحد : اقبال اس کا فکر و فن صفحہ ۵۶

۳ ایس۔اے واحد :- " " صفحہ ۵۶

۴ اقبال :- مکتوب بنام پروفیسر نکلسن (تعارف) صفحہ ۲۷

۳۱ ۱ اقبال :- اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید صفحہ ۱۴۸

۲ یہ قول حضرت علیؓ سے بھی منسوب کیا جاتا ہے (ٹ۔ج۔ دیبوئر : تاریخ فلسفۂ اسلام۔ مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین۔ مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۳۷ء صفحہ ۲۷)

۳۳ ۱ اقبال :- بالِ جبریل (روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے۔)

۳۴ ۱ اقبال :- اسرارِ خودی۔ ممکناتِ قوتِ مردانِ کار۔ گرد باز مشکل پسندی آشنا

۲ اقبال :- پیامِ مشرق :- تو شب آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ایاغ آفریدم

۳ حضرت جلال الدین محمد بن بہاء الدین محمد بن الحسین البکری المعروف بہ مولانا رومؒ ۶۰۴ھ میں بمقام بلخ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ کم سنی ہی میں شیخ فریدالدین عطارؒ سے ملاقات ہو گئی تھی۔ شیخ نے ہونہار دیکھ کر اپنا اسرار نامہ عطا کر دیا۔ والد کے انتقال کے بعد کئی شہروں میں تعلیم مکمل کر کے قونیہ میں آ کر ٹھہر گئے۔ اسی دوران شمس تبریزؒ کے مرید ہو گئے۔ جو کچھ عرصہ کے بعد قونیہ چھوڑ کر اپنے وطن تبریز چلے گئے۔ ان کے فراق میں مولانا کے دل کا سوز و گداز اتنا بڑھا کہ عالم وارفتگی میں وہ اشعار

صفحہ حاشیہ

[illegible] ۲۶۷۲ میں وفات پائی
[illegible] عجم۔ لاہور
(۱۹۲۷ء صفحہ ۱۸۶-۱۸۸)

۲۵ ۱۔ [illegible] رہنے سے بچتے ہیں۔
۲۔ [illegible] اقبال اس کا منکر [illegible] صفحہ ۹۷

۲۷ ۱۔ اقبال: بال جبریل (ساقی نامہ)

۳۰ ۱۔ اقبال: پیرِ مشرق۔ تو اگر زندگی کے راز سے واقف ہے تو ایسے دل کو
"دانش نہ کر ادا۔ ایسا دل مت لے جو خمار آرزو کی خلش سے
عاری ہو۔

۲۹ ۱۔ اقبال: مکتوب بنام پروفیسر نکلسن (تعارف) صفحہ
۲۔ خواجہ غلام السیدین: اقبال کا فلسفۂ تعلیم صفحہ ۵۵
۳۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں: روحِ اقبال مطبوعہ دہلی ۱۹۶۶ء صفحہ ۱۲۶
۴۔ اقبال: بال جبریل (ساقی نامہ)
۵۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں: روحِ اقبال ۱۹۶۶ء صفحہ ۱۲۸

۳۰ ۱۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں: " " صفحہ ۱۲۹
۲۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں: " " صفحہ ۱۳۰
۳۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں: " " صفحہ ۱۲۹
۴۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں: " " صفحہ ۱۳۰
۵۔ اقبال: جاوید نامہ
۶۔ اقبال: جاوید نامہ

۳۱ ۱۔ اقبال: اسرارِ خودی

صفحہ کا شمار	حاشیہ	
۴۲	۱	ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ روح اقبال ص۱۳۱
	۲	ایس اے ۔ واحد : اقبال اس کا فکر و فن ص۹۸
	۳	ایس ۔ اے واحد ۔ " " " ص۹۸
۴۳	۱	اقبال : بال جبریل (مسجد قرطبہ)
	۲	اقبال : مکتوب بنام پروفیسر نکلسن (تعارف) ص۲۵
	۳	اقبال : بال جبریل
	۴	ایس ۔ اے واحد : اقبال اس کا فکر و فن ص۹۸
	۵	خواجہ غلام السیدین : اقبال کا فلسفۂ تعلیم ص۱۴۳
	۶	اقبال : جاوید نامہ : جس کو خوراک کے لیے جو کی روٹی کافی ہو ۔ اس کا عشق خیبر کا دروازہ اکھاڑ لیتا ہے ۔ اور عشق چاند کو چاک کر دیتا ہے
۴۴	۱	ایس اے ۔ واحد : ۔ اقبال اس کا فکر و فن ص۹۲
	۲	حضرت بایزید بسطامیؒ (م ۔ ۸۷۵ء)
	۳	اقبال : ۔ ضرب کلیم
۴۵	۱	قرآن مجید : ۔ البقرہ (۲ ۔ ۲۷۳)
۴۶	۱	قرآن مجید : ۔ صٓ (۳۸ : ۲۴)
	۲	اقبال : ۔ مکتوب بنام پروفیسر نکلسن (تعارف) ص۲۶
	۳	اقبال ۔ بال جبریل (گدائی)
۴۸	۱	سب سے بہتر دولت مندی، دل کا غنی ہونا ہے ۔
	۲	اے مرد فقیر! زہد اور تقویٰ کیا ہے؟ کسی بادشاہ یا امیر سے کوئی غرض نہ رکھنا اگر تجھے بے شمار دولت مل جائے اور تیری ہمت بلند نہ ہو تو وہ دولت بیکار ہے
۴۹	۱	مولانا سید محمد میاں : ۔ پانی پت اور بزرگانِ پانی پت مطبوعہ دہلی ۱۹۶۳ء

حواشی

۴۴

صفحات ۲۵ لغایۃ ۴۰-۵۰-۵۱-۱۶۴

خوطہ، منصف، تحصیلدار، حاکم

۳۰ ۱ اقبال، ضربِ کلیم (نصیحت غلامی)

۳۱ ۲ طالب جعفری، ینابیع التصوف، مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۱ء ص ۲۵۳

" برٹرینڈ رسل Bertrand Russell، صدی کا مشہور برطانوی باغی اور فیلسوف

۳ دل دوراں: مرد فلسفہ ص ۳۶

" ناصرہ Nazareth، فلسطین کا ایک قصبہ جو مسیحی تبلیغ کا مرکز رہا ہے۔

۳۲ ۱ طالب جعفری، ینابیع التصوف ۱۹۶۱ء ص ۲۶ (بحوالہ الملل والنحل ترجمہ مطبوعہ حیدرآباد ج ۲ ص ۲۰۵)

۲ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، خلافت و ملوکیت مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء ص ۱۹۶

۳۳ ۱ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی:- " " ص ۱۷۰

۲ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی:- " " ص ۱۹۶

۳ طالب جعفری، ینابیع التصوف ۱۹۶۱ء ص ۲۷

۴ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، خلافت و ملوکیت ۱۹۶۹ء ص ۹۶

۵ ان لوگوں کی نظر میں آخرت کے بدلے سے مراد خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات ہوگی۔

۶ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، خلافت و ملوکیت ۱۹۶۹ء ص ۲۰۰

۷ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی: " " ص ۱۹۹

۳۴ ۱ عین مقصود (Ideal) ہے۔

عینیت - عینیت Idealism عینیین Idealists

۵۵ | ۱ وِل ڈیوراں : سرور فلسفہ ص ۳۵۹
۲ وِل ڈیوراں : " " ص ۱۷۰

۵۶ | ۱ نوافلاطونیت Neo Platonism
۲ طالب صفوی - ینابیع التصوف ۱۹۶۱ء ص ۲۵۹
۳ فلاطنس (Plotinus) افلاطینی نس کا مصری حکیم ۲۰۵ء میں پیدا ہوا اور ۲۷۰ء میں بمقام روم انتقال کر گیا۔ وہ شیخ سے تحقیق علم کا قائل تھا اور افلاطون کی طرح ماورائی الکائنات و عقل و عقلیات سے بالاتر غیر مجسم خدا کو مانتا تھا (پلاٹی نیوس کے ۹ رسالے مترجمہ طالب صفوی مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۶۶ء ص ۷۵)

اپنے خیال میں وہ افلاطون کا شارح اور متبع تھا مگر اس کے خیالات اپنے پیش رو سے کچھ اس قدر مختلف تھے کہ افلاطون سے ان کی نسبت بھی غلطی ہے۔ (مالک رام، ایم۔اے: فرہنگ خیال (اقبال نمبر اکتوبر ۱۹۳۷ء ص ۱۲۹ (فٹ نوٹ

" فیثاغورث - (Pythagoras) یونانی فلسفی اور ریاضی دان (چھٹی پانچویں صدی قبل مسیح)

۴ پرونیڈیر اور اسپرانک :- دیباچہ پلاٹی نیوس کے ۹ رسالے مترجمہ طالب صفوی صفحات ۲۴، ۱۹-۲۰

" وسطی افلاطونی فلسفے کا اثر نہ صرف اشراقی فرقے کے افراد پر پڑا، بلکہ جادوگروں اور کیمیا کے شائقین کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی اس سے متاثر ہوئے جو مذہب اور فلسفے میں مطابقت کی کوشش کر رہے تھے۔

(طالب صفوی - پلاٹی نیوس کے ۹ رسالے ص ۱۷)

صفحہ	حاشیہ	
۵۷	۱	طالب مغوری۔ پلاٹی نیوس کے ورسلے ص ۹۲
۵۸	۱	طالب مغوری: دیباچہ پلاٹی نیوس کے ورسلے ص
	۲	طالب مغوری: ینابیع التصوف ص ۱۵
	۳	مولینا سید محمد میاں: پانی پت اور بزرگانِ پانی پت ص ۳۱
۵۹	۱	ڈاکٹر یوسف حسین خاں: روحِ اقبال ص ۱۳۱-۱۳۲
۶۰	۲	اقبال: ضربِ کلیم (صوفی سے) اور (تصوف)
۶۱	۳	ڈاکٹر یوسف حسین خاں: روحِ اقبال ص ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۹ لغایۃ ۱۴۱
	۴	اقبال: ضربِ کلیم
۶۲	۱	اٹیلا Attila ہنوں کا بادشاہ (تقریباً ۴۳۴ء سے ۴۵۳ء) اسے خدائی تازیانہ کہا جاتا ہے۔ اس کی فوجوں نے مشرقی یورپ سے بڑھ کر یورپ کے بیشتر حصہ کو روند ڈالا تھا۔
	۲	چنگیز خاں۔ منگول خوں ریز شہنشاہ (۱۱۶۲ء۔ ۱۲۲۷ء) جس کی فوجوں نے چین، روس، ایران، ہندوستان وغیرہ کو تاخت و تاراج کیا۔
۶۳	۱	اقبال: دیباچہ مرقعِ چغتائی (ڈاکٹر یوسف حسین خاں: روحِ اقبال ص ۱۹۶۶ء)
	۲	ڈاکٹر یوسف خاں: روحِ اقبال ص ۱۹۶۶ء صفحات ۲۲-۱۵-۲۵-۲۹-۱۷
۶۴	۱	اقبال: ضربِ کلیم (تربیتِ خودی)
۶۵	۱	قرآن مجید: الاحزاب (۳۳: ۷۲)۔ اقبال اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید ص ۸۹
	۲	خواجہ غلام السیدین۔ اقبال کا فلسفۂ تعلیم ص ۴۳
	۳	اقبال: اسرارِ خودی۔ آنا دم کا کام ہر گھڑی نت نئی تخلیق میں لگا رہنا ہے اس کے سانسوں کے تاروں سے مسلسل نغمے پیدا ہوتے ہیں اسکی لطافت کچھ بھی دکھانے کی حاجت نہیں جہاں کی آنکھ کا ستارہ پرکار کا حلقہ ہو جاتا۔

صفحہ	حاشیہ	
۶۷	۱	اقبال:۔ بالِ جبریل۔
	۲	اقبال: اسرارِ خودی۔ ہمزہ' دین نبی کا پابند ہو کر رہ گیا ہے، اور اسے ترک کرنے کی وجہ سے روندا گیا ہے۔
	۳	اقبال: اسرارِ خودی:۔ آئین کی سختی کا شکوہ مت کر۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی قائم کی ہوئی حدوں سے باہر نہ جا۔
۶۸	۱	قرآن مجید:۔ البقرہ (۲: ۳۰، ۳۳)
۶۹	۱	اقبال: پیامِ مشرق۔ عشق نے نعرہ لگایا کہ خونِ جگر پیدا ہو گیا۔ حسن نے انگڑائی لی کہ ایک صاحبِ نظر پیدا ہوا۔ فطرت بے حواس ہوئی کہ اس جہانِ مجبور کی خاک سے ایک خود شکن خود گر خود نگر نے جنم لیا۔ آسمان نے شبستانِ ازل کو پیغام پہنچایا کہ اے پردہ دارو! بچکر رہو۔ کیونکہ حجابات اٹھانے والا پیدا ہوا۔ آغوشِ حیات میں اپنے سب بے خبر آرزو نے آنکھ کھولی اور دوسرا جہان رونما ہو گیا۔
	۲	اقبال:۔ مکتوب بنام پروفیسر نکلسن (تعارف) ص۲۷
	۳	اقبال:۔ ضربِ کلیم
۷۰	۱	یداللہ۔ اللہ کا ہاتھ۔ حضرت علی کا لقب ہے۔
	۲	انا مدینۃ العلم وعلیٌ بابہا: میں علم کا شہر اور علی اس کا دروازہ ہیں (حدیث)
۷۱	۱	(معجزہ حجت خورشید۔ نور الانوار ص۱۰۱ بحوالہ کتاب پیر حاشیہ نور الانوار ص۲)
۷۲	۱	پروفیسر نکلسن: ترجمہ اسرارِ خودی ص۱۵ (نٹ ونٹ)
	۲	ایضاً۔ اسے واحد۔ اقبال اس کا فکر و فن ص۱۱
۷۳	۱	ابو العلاء احمد بن عبداللہ بن سلیمان المعری التنوخی (۱۷۳ھ ۔ ۱۰۵۸ء)

۱۔ ابو الحسن ابن زیدون فلسفی شاعر کا رہنما فاروق قرطبی تاریخ نما
مفکر محمد جس کی تصانیف "الغفران" اور "رومیات" ہیں۔

۲۔ رومیات۔ معری کے قصائد کا مجموعہ رومیات کو لزومیات نظم کیا ہے۔

۳۔ اقبال:۔ بالِ جبریل۔ (ابو العلاء معری)

۴۔ نطشے (Friedrich Wilhelm Nietzche) ۱۸۴۴ء۔ ۱۹۰۰ء
جرمن فلسفی جس کے تصورات سے یورپ بہت متاثر ہوا۔ یورپ کے جنگ بازوں
میں بہت مقبول تھا کا ایڈولف ہٹلر اپنے دست راست مسولینی
کی سالگرہ پر اسکی تصانیف کا مجموعہ تحفے میں بھیجا تھا۔
ریڈرز ڈائجسٹ نومبر ۱۹۷۲ء ص ۱۰۶ بحوالہ جرمن ڈکٹیٹر کی ڈائری

۷۴ ۱۔ ایس۔ اے۔ واحد۔ اقبال اس کا فکر و فن ص ۱۳۳-۱۳۴

۷۵ ۱۔ اقبال: اسرار خودی۔ خودی کے مقامات سے واقف ہو۔ طاقتور
دشمن کو خدا کا فضل سمجھتا ہے۔

۷۶ ۱۔ ایس۔ اے۔ واحد۔ اقبال اس کا فکر و فن ص ۱۳۶

۷۷ ۱۔ عربی فارسی اور انگریزی کی تصانیف ص ۲۳۹

۷۹ ۱۔ اقبال:۔ ضرب کلیم (قوت اور دین)
۲۔ فسطائی (Fascist) فسطائیت کو ماننے والا
فسطائیت (Fascism) سامراج اور سرمایہ داری کی ایک صورت
جو ۱۹۱۹ء کے آس پاس اٹلی میں نمودار ہوئی۔ اٹلی کے مسولینی نے
اسے بہت تقویت دی۔ یہ آمرانہ حکومت سے متعلق ہے۔ تصور کی طاقت
رنگ و نسل اور ایک وطن پرستی کی علامت تھی جو ارمن

۸۱ ۱۔ ایس۔ اے۔ واحد۔ اقبال اس کا فکر و فن ص ۱۲۳ بحوالہ اسپینگلر

صفحہ کا حاشیہ

نطشے کی زندگی اور تصانیف کے چند رخ ص ۱۲۷)

۸۱ ۲ سادیت پسند (Sadist) سادیت (Sadism) نفسیات کی اصطلاح ہے اور اس حالت کو ظاہر کرتی ہے جس میں جنسی لذت تکلیف اور اذیت پہنچانے نیز تباہ کرنے سے وابستہ ہو جائے (جنسی دیوانگی)

۳ ایس۔ اے۔ واحد:۔ اقبال اس کا فکر و فن ص ۱۲۳-۱۲۴

۸۲ ۱ اقبال:۔ ضرب کلیم

۲ پروفیسر نکلسن:۔ ترجمہ اسرار خودی ص ۱۱۸ (فٹ نوٹ)

حضرت میاں میرؒ۔ مشہور درویش سنہ وفات ۱۶۳۵ء مزار لاہور میں ہے۔

۳ اقبال:۔ اسرار خودی جس نے اپنا خنجر اللہ کے مقصد کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے اٹھایا تو اس کا خنجر اسی کے سینے میں پیوست ہوا۔

۸۳ ۱ پروفیسر نکلسن:۔ ترجمہ اسرار خودی ص ۱۲۲ (فٹ نوٹ)

۸۴ ۱ بانگ درا

۲ صنعتی انقلاب Industrial Revolution برطانوی معاشرت و معیشت کا وہ انقلاب جو مشینوں اور بالخصوص بھاپ سے چلنے والے انجنوں کے سبب رونما ہوا۔ اس کے نتیجے میں گھریلو صنعتوں کا دور ختم ہو کر فیکٹریوں اور ملوں کا دور شروع ہوا۔ یہ سنہ ۱۷۵۰ء کے آس پاس شروع ہو کر سنہ ۱۸۵۰ء تک ختم ہو لیا تھا اور اس کا اثر پوری دنیا پر پڑا۔

۳ سامراج = رجعت پسندی اور تشدد کی وہ کوشش جو زور زبردستی کے ذریعہ علاقائی الحاق کی طرف قدم بڑھاتی ہے۔

سرمایہ دارانہ سامراج = سرمایہ داری کی اجارہ دارانہ منزل

۴ اقبال: بالِ جبریل (لینن خدا کے حضور میں)

صفحہ | حاشیہ

۸۵ | ۱ اقبال ضربِ کلیم (دوزخی کی مناجات)

۸۶ | ۱ صفحہ ۲۴ کا حوالہ ۳ ملاحظہ ہو۔

۲ اقبال: ضربِ کلیم

۳ اقبال: اسرارِ خودی۔ اے دوستو اب کیا تدبیر ہو۔ ہمارے پیر کا رخ ..
تو مے خانہ کی طرف ہے۔

۸۸ | ۱ اقبال: بالِ جبریل

۲ اقبال:۔ جاوید نامہ۔ ہر تدبیر میری تقدیر سے وابستہ ہے۔ صاحب زبان
اور بے زبان سب میرے شکار ہیں۔ شاخ میں کلی میرے
طفیل پروان چڑھتی ہے۔ پرندہ میری وجہ سے نالہ کش
ہوتا ہے۔ میری پرواز سے دانہ پودے میں تبدیل ہوتا ہے
میرے فیض سے ہر جدائی وصل بنتی ہے۔ میں ہی عتاب
ہوں۔ میں ہی خطاب ہوں اور میں ہی پیاس دیتا ہوں
تاکہ شراب عطا کر سکوں۔ میں حیات ہوں۔ میں موت ہوں
میں ہی حساب یوم حشر ہوں۔ میں ہی دوزخ ہوں۔ میں
ہی جنت اور میں ہی حور ہوں۔ آدمی اور فرشتہ دونوں
میرے اسیر ہیں۔ یہ چھ دن میں ظاہر ہونے والا عالم بھی میرا ہی پیدا
کردہ ہے۔ میں ہی وہ پھول ہوں جو تو شاخ سے توڑتا ہے
میں ہی ہر اس شے کی اصل ہوں جو تو دیکھتا ہے۔
یہ جہاں میرے طلسم کا اسیر ہے جو ہر لمحہ میرے دم سے بڑھتا ہوتا رہتا ہے

۸۹ | ۲ اقبال:۔ سامی الٰہیات کی تشکیل جدید صفحہ ۱۸۴

۹۰ | ۳ شاہ طہراسپ۔ ہمایوں کا ہمعصر ایران کا بادشاہ

۵۲ اقبال :- اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید ص ۱۰۵

۹۰ ۱ اقبال :- " " ص ۵۱

۲ اقبال : " " ص ۵۸-۵۹

۳ و ۴ اقبال : بال جبریل (مسجد قرطبہ)

۵ اقبال :- اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید ص ۵۸، ۵۹

۹۱ ۱ اقبال : بال جبریل (ساقی نامہ)

۲ غالب - دیوان غالب (اردو)

۳ اقبال : بال جبریل "جاہلوں کا قول ہے کہ زمانہ ساز بن جا، اگر زمانہ تیرا ساز نہیں دیتا تو اس سے جنگ کر۔"

۹۲ ۱ ڈاکٹر یوسف حسین خاں :- روح اقبال ۱۹۶۶ء ص ۳۵۷ (فٹ نوٹ)

" ایک خیال یہ ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے۔ مگر امام رازی نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے

۲ اب - Now یہ وقت - اس وقت

"محمدؐ عربی عرش بریں پر پہنچے اور واپس آگئے۔ خدا کی قسم اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔" مولانا عبدالقدوس گنگوہیؒ کا قول ہے۔

(اقبال :- اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید ص ۱۲۴)

۹۳ ۱ ڈاکٹر یوسف حسین خاں :- روح اقبال ص ۲۶۷ بحوالہ اقبال :-

عزم او خلاق تقدیر حق است
روز ہیجا تیر او تیر حق است

(اس کا عزم تقدیر حق کو خلق کرنے والا اور روز جنگ اس کا تیر تیر حق ہے)

قرآن مجید :- وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ - (اے پیغمبر

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

۹۴ ا [illegible] کتاب الایمان صفحہ

اسرارِ خودی (اردو)

۱۰۰ [illegible] (انیس)

۱۰۲ [illegible] کر دیتے ہیں [illegible] (نکلسن)

۱۰۳ (۱) مثنوی [illegible] ہے جس کے لیے کہا جاتا ہے کہ
مثنوی مولوی معنوی - ہست قرآں در زبان پہلوی

۱۰۴ (۱) [illegible]
۲ [illegible]
۳ [illegible]

۱۱۰ (۱) [illegible] مورخہ [illegible] ہوئے ہیں۔

۱۱۲ [illegible]

۱۱۳ [illegible] کر دیا

صفحہ کا شمار حاشیہ

اسی کی طرف تلمیح ہے۔ (اقبال)

" قرآن مجید کے رو سے یہ وہی الفاظ ہیں جو حضرت یوسفؑ نے اپنے ظالم بھائیوں کو معاف کرتے ہوئے کہے تھے: قَالَ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (یوسفؑ نے) کہا آج کے دن تم پر (میری جانب سے) کوئی سرزنش نہیں (قرآن مجید: یوسف ۱۲: ۹۱ - ترجمان قرآن (۲) آزاد)

(۲) تلمیح ہے استن حنانہ (بین، آہ و بکا کرنے والے ستون) کی طرف۔ مسجد نبوی میں حضور نبی کریمؐ لکڑی کے ایک ستون سے بدن لگا لیتے تھے۔ آپ کی رحلت کے بعد اس ستون سے رونے کی آواز آیا کرتی تھی۔

۱۱۴ ؎ حضور نبی کریمؐ کتاب کونین کا دیباچہ ہیں جملہ عالم خادم اور وہ مخدوم ہیں

(۲) حضرت بایزید بسطامی (م ۲۷۵ھ) ملاحظہ ہو صفحہ سابق ۴۴

۳ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (اور اے پیغمبر! اس حقیقت پر غور کرو) جب ایسا ہوا تھا کہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا: میں زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں۔ (قرآن مجید: البقرہ: ۲۸ ترجمان قرآن (۱) آزاد)

۱۱۵ ؎ ملاحظہ ہو صفحہ سابق ۴۶

۲ ؎ یہ ریت کا تودہ جو اپنے وجود سے اپنا رزق اس طرح حاصل کرتا ہے کہ اس کی ریت پھسل کر بھی اس کے پہلو ہی میں رہتی ہے نکلسن نے اپنے انگریزی ترجمہ میں اس کا ترجمہ چاند ہی کیا ہے جو میری رائے میں صحیح نہیں کیونکہ دو چار اشعار کے بعد ہی علامہ نے چاند کو سورج کا دست نگر بتایا ہے۔

۱۱۶ ؎ الکاسب حبیب اللہ۔ کاسب (محنت سے روزی کمانے والا) اللہ کا دوست ہے۔ (حدیث شریف)

۱۱۷ (۱) حضرت بو علی شاہ صاحب قلندرؒ کے شعر مرحبا ای بلبل باغ کہن۔ از گل ما گو نوا آموختن

صفحہ	حاشیہ	
۱۲۰	۱	اشعر۔ بہترین (شہرت پسند یا دشمن تن ۔ بحقیق کامطول دان
۱۲۵	(۱)	سینا = کوہ سینا۔ کوہ طور
۱۳۱	(۱)	عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ۔ جیسے آیت قرآنی کی طرف۔ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝ اور بہتر ٹھکانا تو اللہ ہی کے پاس ہے۔
		قرآن مجید: آل عمران ۳-۱۴ — ترجمان قرآن (۱) آزاد
۱۳۳	(۱)	حضرت ابراہیمؑ کے ایمان اور حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کی طرف اشارہ ہے۔
〃	(۲)	اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ یقیناً صلوٰۃ (نماز) بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔ قرآن مجید:۔ العنکبوت ۲۹: ۴۵
〃	(۳)	لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۝ (یعنی) نیکی کا درجہ کبھی حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ تم یہ باتیں پیدا نہ ہو جائے (مال و دولت میں سے) جو کچھ محبوب رکھتے ہو اسے (راہ حق میں) خرچ کرو۔
		(قرآن مجید:۔ آل عمران ۳: ۹۲، ترجمان قرآن (۱) آزاد)
۱۳۴	(۱)	ملکِ لَا یَبْلٰی = وہ ملک جو زمانے کی دست برد سے محفوظ ہے۔
۱۳۵	(۱)	حضور نبی کریمؐ کی طرف اشارہ ہے۔
	(۲)	یعنی آیات قرآنی کی طرف۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا... اور آدم کو تمام چیزوں کے نام (تعلیم الٰہی سے) سکھا دیئے۔
		(قرآن مجید البقرہ ۲: ۳۱ ترجمان قرآن (۱) آزاد)
		سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَى الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ۝ (پاکی ہے اس ذات کے لیے جس نے اپنے بندے کو ایک معجزہ اسرار کو ایک رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی جس کے گرد ہم نے برکت دی ہے تاکہ ہم اس کو اپنی نشانیاں دکھائیں)

صفحہ نمبر | حاشیہ

تیر کرانی کہ اپنی نشانیاں اسے دکھا دیں۔ (معراج کی طرف اشارہ ہے)

(قرآن مجید: بنی اسرائیل ۱۷: ۱۔ ترجمان قرآن (۲) آزاد)

۱۳۵ (۳) حضرت موسیٰؑ کے عصا اور معجزے کی طرف اشارہ ہے

(۴) حضرت عیسیٰؑ کے معجزے کی طرف اشارہ ہے

۱۳۷ (۱) مرتضیٰ (پسندیدہ، منتخب)، بوتراب (مٹی کا باپ)، یداللہ (اللہ کا ہاتھ) شیر حق (شیر خدا)، فاتح خیبر (قلعہ خیبر کو فتح کرنے والا)، ساقی کوثر (قیامت کے دن حوض کوثر پر پیاسوں کو سیراب کرنے والا۔

یہ سب حضرت علیؓ کے نام ہیں۔

۱۳۸ (۱) معجزۂ رجعت خورشید (خود شمس) کی طرف اشارہ ہے۔

۱۴۰ (۱) کُنْ = امر تکوین۔ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ وہ (اللہ) جب کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے، تو (نہ تو اسے کسی مددگار کی ضرورت ہوتی ہے نہ وسائل و ذرائع کی) بس وہ حکم دیتا ہے کہ ہو جائے اور جیسا کچھ اس نے حکم دیا تھا ویسے ہی ظہور میں آ جاتا ہے۔

(قرآن مجید۔ البقرۃ ۲: ۱۱۲ ترجمان قرآن (۱) آزاد)

۱۴۱ (۱) خواجہؒ۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ جو حضرت ہجویریؒ کے مزار پر تشریف لائے تھے۔

(۲) عہد فاروق۔ حضرت عمر فاروقؓ کا شاندار عہد خلافت۔

فاروق = فرق کرنے والا (حق و باطل میں)

۱۵۱ ۱ شہب سے مراد اقبال کا لاہور ہے جہاں حضرت شیخ میاں میرؒ (۱۶۳۵ء) کا مزار ہے

۱۵۴ (۱) تشکک و اشراق۔ قدیم فلسفۂ یونان کے دو اسکول۔ مؤخر الذکر افلاطون کے فلسفے کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں میں اس کے جامع اور مرتب شیخ شہاب الدین سہروردی

صفحہ کا حاشیہ

مقتول تھے جن کو سلطان صلاح الدین نے علمائے وقت کے فتوے پر قتل کرا دیا تھا (اقبال)
مشائین۔ حکماء کا وہ گروہ جو ارسطو کا متبع ہے۔

(۲) پیر تبریزی۔ حضرت شمس تبریزی

کمال۔ حضرت شیخ کمال الدین جنیدی

۱۵۵ (۱) آفل = غروب ہونے والا۔ زوال پذیر

تلمیح ہے لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ کی طرف۔ فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ اللَّیْلُ رَاٰ کَوْکَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّیْ ج فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ۝

پھر (دیکھو) جب ایسا ہوا کہ اس پر رات کی تاریکی چھا گئی، تو اس (حضرت ابراہیمؑ) نے آسمان پر ایک کوکب (چمکتا ہوا) دیکھا۔ اس نے کہا "یہ میرا پروردگار ہے" (کہ سب لوگ اس کی پرستش کرتے ہیں) لیکن جب وہ ڈوب گیا تو کہا "نہیں، میں انہیں پسند نہیں کرتا جو ڈوب جانے والے ہیں"

قرآن مجید:۔ الانعام ۶ : ۷۷ ترجمان قرآن (۱) آزاد

۱۵۸ (۱) دریائے احمر = Red Sea وہ سمندر جو جزیرہ نمائے عرب کو افریقہ سے الگ کرتا ہے

۱۵۹ (۱) خط = لکیر

(۲) احرار۔ حُر کی جمع ہے۔ حُر بمعنی آزاد

(۳) لِیْ مَعَ اللّٰہِ — ملاحظہ ہو صفحہ سابق ۹۲

(۴) عاشور = ماہ محرم کا دسواں دن۔ حضرت امام حسینؑ کی شہادت کا دن، یوم غم و آلام

۱۶۰ (۱) لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ۔ ملاحظہ ہوں صفحات سابق ۹۲-۹۴

(۲) عبد = غلام

۱۶۳ (۱) سلمان رضؓ فارسی اور بلال حبشی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔ ان دونوں کا ایمان اور حضورؐ کی ذات سے عشق مثالی ہے۔

۱۶۳ (۲) آیات = جمع ہے آیت کی۔ آیت بمعنے نشانی

(۲) اعدا۔ عدو کی جمع ہے۔ عدو بمعنے دشمن۔ خاضعین۔ سبک سر۔ ذلیل

اِنْ نَشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاۗءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ

الشعراء۔ ۴۶: ۱۴